مین گنجائش نہین، مصنف کے حسن نیت مین شبہ نہین لیکن اگر وہ مخمل مین ٹاٹ کا پیوند نہ لگاتے تو یہ مجموعہ زیادہ مفید ہوتا، تاہم اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہین ہے،

نظامی بدایونی۔ مرتبہ جناب محمد احمد صاحب کاظمی، ایڈوکیٹ الہ آباد، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۵ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ محمد احید الدین احمد صاحب نظامی پریس، بدایون،

مولوی نظام الدین حسین مرحوم نظامی بدایونی سابق اڈیٹر ذوالقرنین ہماری پرانی تہذیب کے ان یادگارون مین تھے جن کے نمونے اب نہ پیدا ہون گے، ان کی ساری زندگی مسلمانون کی خاموش خدمت مین گذری، تعلیم سے ان کو خاص دلچسپی تھی، وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممتاز رکن اور پراونشل کانفرنس کے سکریٹری تھے، اور اس کے ذریعہ انھون نے نہ صرف تعلیمی بلکہ دوسری مفید خدمات بھی انجام دین، ان کا اخبار ذوالقرنین تقریباً نصف صدی سے جاری ہے، ان کے نظامی پریس نے اردو زبان وادب کی بہت سی قابل قدر کتابین اور دیوان غالب، مراثی میر انیس اور مثنویات میر کے نہایت نفیس اڈیشن شائع کیے، مرحوم خود متعدد کتابون کے مصنف تھے، ان مین قاموس المشاہیر زیادہ اہم اور اپنے موضوع پر اردو مین پہلی کتاب ہے، اس مین ہر طبقہ کے نامور اور ممتاز اصحاب کمال اور نامور مشاہیر کے حالات ہین، غرض مرحوم نے زندگی کے ہر شعبہ مین قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے اور ان کی زندگی نوجوانون کے لیے شمع راہ کا کام دے سکتی ہے، اس لیے جناب محمد احمد صاحب کاظمی نے ان کے سوانح لکھ کر ایک مفید خدمت انجام دی ہے، اس مین مرحوم کے خاندانی حالات انکی قومی، ملکی اور علمی و تعلیمی خدمات اور ان کے اخلاق و سیرت کی تفصیل ہے، امید ہے قومی کارکنون کے حلقہ مین خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کی قدردانی کی جائے گی،

"م"

جلد ۶۳ ماہ شعبان المعظم ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۹ء عدد ۶

مضامین

شذرات

سرکاری تعلیم گاہون مین اردو کی تعلیم کے مسئلہ پر معارف مین اس سے پہلے بھی لکھا جاچکا ہے، اب یہ خطرہ بالکل سر پر آگیا ہے، اور نئے تعلیمی سال یعنی اگلے مہینہ سے ہائی اسکولون مین جو نصاب جاری ہونے والا ہے، اس کی شکل ایسی رکھی گئی ہے کہ اردو بغیر کسی کوشش کے خود بخود تعلیم سے خارج ہوجائیگی، مرکزی شعبہ تعلیم نے تو یہ طے کیا تھا کہ جن اسکولون مین طلبہ کی ایک معقول تعداد اپنی کسی مادری زبان کی تعلیم حاصل کرنا چاہے گی تو اس کا انتظام کیا جائیگا، یوپی گورنمنٹ نے ابتدائی تعلیم کے لیے بھی اسی قسم کا حکم جاری کیا تھا، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ابتدائی تعلیم مین تو اردو کا کہین گذر ہی نہین ہے، بلکہ بعض مقامون پر تو اسلامی مکاتیب کے طلبہ کو بھی ہندی پڑھنے پر مجبور کیا جارہا ہے، ثانوی تعلیم یعنی ہائی اسکولون مین تو ہندی کو تو لازمی رکھا ہے، اور اردو کو انگریزی کے ساتھ محض اختیاری زبان کی حیثیت دی گئی ہے، انگریزی کی علمی تعلیمی اور کاروباری اہمیت ایسی ہے کہ ہندوستان ابھی مدتون اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اس کے بغیر تعلیم ہی ناقص رہے گی، اس لیے مسلمان طلبہ ہندی کے ساتھ دوسری زبان انگریزی لینے پر مجبور ہون گے، اس کے علاوہ ابتدائی تعلیم مین یعنی پانچوین درجہ تک اردو کا وجود ہی نہین ہے، اس لیے جو طالب علم پانچوین تک اس سے ناواقف رہے گا، چھٹے مین اس کو اردو لینے مین دشواری پیش آئے گی، اس لیے مسلمان طلبہ ہر حیثیت سے اردو چھوڑنے پر مجبور ہون گے، اس طرح خود بخود اس کا قصہ ختم ہوجائیگا۔

آخر کہان تک حسن ظن کو راہ دی جائے، اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق کیا جارہا ہے، کہ گننے کو تو اردو کی تعلیم قائم رکھی جائے لیکن شکل ایسی اختیار کی جائے کہ طلبہ خود اس کے چھوڑنے پر مجبور ہوجائین،

مسلمانون کے لیے اردو کی تعلیم کا مسئلہ محض تعلیمی اور لسانی نہین، بلکہ کلچرل بھی ہے، ہندی خالص ہندو کلچر کی نمایندہ ہے، اردو مین دونون کلچرون کے اثرات ہین، کلچر پر زبان کا بڑا اثر پڑتا ہے، اس لیے اگر مسلمان اردو سے ناواقف اور تنہا ہندی کے سہارے پر رہ گئے تو ان کا کلچر بھی رفتہ رفتہ بدل جائے گا، اور دو تین پشتون کے بعد وہ صرف نام کے مسلمان رہ جائین گے، اس طرح بغیر کسی تشدد کے وحدت کلچر کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا، لیکن اگر حکومت کا یہ منشا نہین ہے تو اسے اردو کو بھی لازمی زبان کا درجہ دے کر اپنے حسن نیت کا ثبوت دینا چاہیے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسری شکل ہی نہین ہے، اس وقت تعلیم گاہون مین اس کے ساتھ بے اعتنائی برتی جا سکے گی، لیکن اگر حکومت ایسا نہین کرتی تو اس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اردو زبان اور اس کے ساتھ مسلمانون کے کلچر کو بھی ختم کر دیا جائے،

یہ عجیب تضاد ہے کہ دعویٰ تو متحدہ قومیت، اور حکومت کے غیر مذہبی ہونے کا کیا جاتا ہے، لیکن اعمال سب اس کے سراسر خلاف ہین، اردو دشمنی سے بڑھ کر فرقہ پروری اور کیا ہو سکتی ہے، یہ تو دو قومی نظریہ کی عملی تصدیق ہے، اگر اردو ہندو مسلمان دونون کی زبان ہے تو پھر اس کو ختم کرنے کے کیا معنی، اور اگر تنہا مسلمانون کی ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دونون دو قوم ہین، یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ محتاط نیشنلسٹ اخبارات بھی اپنی روش کے خلاف اس پر لکھنے کے لیے مجبور ہو گئے، ایسے مسائل پر دب کر نہیں بلکہ واشگاف لکھنے کی ضرورت ہے، ع نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی،

جمعیۃ العلماء نے مسلمانون کے مذہبی تعلیمی اور تمدنی کامون کو اپنے ذمہ لیا ہے، اردو مین یہ تینون حیثیتین جمع ہین، اس کی تعلیمی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے عام مشترک اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے، مذہبی اور کلچرل حیثیت یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانون مین اسلامی علوم و فنون کا سب سے بڑا ذخیرہ اور اسلامی کلچر کے سب سے زیادہ اثرات اسی مین ہین، اور ہندوستان کے مسلمانون کا بڑا طبقہ جو عربی سے ناواقف ہے وہ اردو ہی کے

وہ یہ مذہبی معلومات حاصل کرتا ہے، اس لیے جمعیۃ کا فرض ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس کو حکومت سے منوانے کی کوشش کرے، وہ تو بیرونی اور جابر حکومت کے مقابلہ مین بڑے بڑے معرکے سر کر چکی ہے، اردو کا مسئلہ تو ان کے مقابلہ مین بہت معمولی اور پھر حکومت اپنی ہے، حکومت کی غلط روی پہ ٹوکنا اور ضرورت ہو تو قوت کے ساتھ روکنے کی کوشش کرنا اس کی مخالفت نہین بلکہ اصلاح اور عین خدمت ہے، اسی کے ساتھ اسلامی مکاتیب کے کام کو بھی ہاتھ مین لینا چاہیے، لیکن اس کے لیے عملی جدوجہد کی ضرورت ہے، جمعیۃ کے کارکن جس جوش و انہماک سے الیکشن لڑتے تھے اگر اس کی عشر و عشیر کوشش بھی مکاتب کے لیے وہ کرین تو انشاء اللہ اس مین ضرور کامیابی ہوگی۔

دار المصنفین کی اپیل جن معاصرین نے شائع کی، اور اس پر نوٹ لکھے، ہم ان سب کے شکر گذار ہین، لیکن افسوس ہے کہ اردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کی محبت کے دعویدارون نے اس کی جانب بہت کم توجہ کی، زبانی تو ان کے زوال کا بڑا ماتم ہے، لیکن عمل یہ ہے کہ ان ادارون کی جانب بھی جو برسون سے اردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت کرتے چلے آئے ہین، اور انشاء اللہ آئندہ بھی کرتے رہین گے، کوئی توجہ نہین، اور ان کی معمولی ممبری قبول کرنا بھی جس کے معاوضہ مین ان کو کتابین مل جائین گی، ان کے لیے بار ہے، کیا اسی طرز عمل پر اردو زبان اور اسلامی کلچر سے محبت کا دعوی ہے؟ اور کیا اسی پر وہ زندہ رہین گے؟ تاہم دار المصنفین کے کچھ پرانے مخلصین اس کے لیے پوری کوشش کر رہے ہین، اور توقع ہے کہ انشاء اللہ یہ تحریک بے اثر نہ رہے گی۔

مقالات

تدوین قرآن

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

صحابہ کا حفظ و جمع قرآن صحابہ کرام مین بہت سے بزرگ ایسے تھے جنھون نے پورا کلام مجید جمع اور حفظ کیا تھا، بخاری مین ہے :-

عن قتادة سألت انس بن مالک	قتادہ کا بیان ہے کہ مین نے انس بن مالک سے
من جمع القرآن علی عهد النبی	پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین
صلی الله علیه وسلم قال اربعة	کن کن لوگون نے قرآن جمع کیا تھا، انھون نے
کلهم من الانصار، ابی بن کعب	کہا چار آدمیون نے اور چارون انصاری تھے،
ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت	ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت
وابو زید[1]	اور ابو زید،

بخاری کے اسی باب کی دوسری روایت مین ابی بن کعب کے بجائے حضرت ابودرداءؓ کا نام ہے[2]، کنز العمال مین طبرانی اور مستدرک کے حوالہ سے جامعین قرآن مین ایک نام سعید بن عبید کا بھی ہے[3]، یہان جمع قرآن سے

---

[1] بخاری ج ۲ ابواب فضائل القرآن باب القراء من اصحاب النبی صلعم [2] ایضاً [3] کنز العمال ج اول ص ۲۴۴

مراد پورے قرآن کا جمع کرنا ہے، ورنہ چار آدمیون کی تخصیص کے کوئی معنی نہین، کیونکہ قرآن مجید کا کچھ نہ کچھ حصہ تو ہر صحابی نے جمع کیا تھا، اس لیے باتفاق علماء جمع سے مراد پورے قرآن کا جمع کرنا ہے،

ان مین حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود و ابی بن کعبؓ کی پورے قرآن کی جمع و تدوین تو تاریخی مسلمات مین ہے، ان بزرگون کے مرتب کردہ مصاحف مدتون موجود رہے، ممکن ہے اب بھی انکا کوئی نسخہ کہین پایا جاتا ہو،[1] ابن ندیم اور سیوطی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعب کے مصاحف خود دیکھے تھے، اور فہرست و اتقان مین ان کی سورتون کے نام اور ان کی ترتیب نقل کی ہے۔[2] ان مین اور موجودہ مصحف مین صرف یہ فرق ہے کہ ان دونون مصحفون کی سورتون کے بعض نام اور ان کی ترتیب مصحف عثمانی سے مختلف ہے جو کوئی ایسا فرق نہیں ہے، اس لیے کہ خود موجودہ مصحف کی بعض سورتون کے ایک سے زیادہ نام ہین، اور سورتون کی ترتیب توقیفی نہین ہے، اس لیے یہ فرق کوئی اہمیت نہین رکھتا، البتہ ایک خاص فرق یہ ہے کہ موجودہ کلام مجید مین ۱۱۴ سورتین ہین، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف مین ۱۱۰ اور حضرت ابی بن کعبؓ کے مصحف مین ۱۱۶ ہین،[3] یعنی ایک مصحف مین چار کم اور ایک مین دو زیادہ ہین، اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سورہ فاتحہ اور معوذتین یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کو کلام مجید کی سورہ اور اس کا جز نہین سمجھتے تھے، بلکہ محض دعا سمجھتے تھے، اس لیے ان کو اپنے مصحف مین شامل نہین کیا، لیکن اس خیال مین وہ منفرد تھے ورنہ اور صحابہ ان تینون کو کلام مجید کی سورہ اور اس کا جز تصور کرتے تھے،[4]

[1] حضرت علیؓ کے مرتب کردہ مصحف کے نسخے تو متعدد پائے جاتے ہین لیکن آپ کی جانب انکی نسبت مشکوک ہے،
[2] ملاحظہ ہو فہرست ابن ندیم ص ۳۹، ۴۰ و اتقان ج ۱ ص ۶۵
[3] ابن ندیم نے جتنی سورتین نقل کی ہین انکی تعداد اس سے کم ہے لیکن میزان مین پوری تعداد یعنی ۱۱۰ و ۱۱۶ لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً کچھ نام چھوٹ گئے ہین
[4] تفسیر در منثور ج ۱ ص ۱ و ج ۶ ص ۴۱۶

لیکن چوتھی سورہ کی کمی کا سبب نظر سے نہین گذرا، اس لیے ان کے مصحف مین سورتون کی تعداد ۴ کم یعنی ۱۱۰ ہے، اور حضرت ابی بن کعب دعاے قنوت کو قرآن کی دو سورتین قرار دیتے تھے، اس لیے ان کے مصحف مین خلع اور حفد کے نام سے دو سورتین زیادہ ہین،[1] لیکن اس کو کلام مجید مین تغیر قرار نہین دیا جا سکتا، اسلیے کہ یہ ان بزرگون کی رائے تھی جو معلوم و مشہور ہے، اور جس کی تصریح کتابون مین موجود ہے،

حضرت علیؓ کے مرتب کردہ قرآن کی ترتیب نزولی تھی، اور نزولی ترتیب اہل علم کو پوری طرح معلوم ہے، اس مین سورتون کی ترتیب کے علاوہ اور کوئی فرق نہین،

عہد صدیقی مین جمع قرآن کی نوعیت

مذکورہ بالا مباحث سے یہ پوری طرح ثابت ہو گیا کہ آیتون اور سورتون کی ترتیب عہد نبوی مین ہو چکی تھی، اور متعدد صحابہ نے اپنے طور پر بھی علحدہ علحدہ کلام مجید مرتب کیے تھے، مگر اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ مین کیا کام انجام پایا، اور ان کی جمع و ترتیب قرآن سے کیا مراد ہے، درحقیقت اس سے مراد آیتون اور سورتون کی ترتیب نہین بلکہ ان کی کتابی تدوین ہے، یعنی تمام آیتین مرتب اور ہر سورہ اپنی جگہ پر مکمل تھی، اور اس حیثیت سے سورتون کی ترتیب بھی معلوم تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جگہین متعین فرما دی تھین، لیکن یہ ترتیب توقیفی نہین تھی، اور سورتین کتابی شکل مین مدون نہ تھین بلکہ ان کے مختلف اجزا علحدہ علحدہ اونٹ کی ہڈیون، کھجور کی شاخون، پتھر کی پتلی تختیون اور چمڑے کے ٹکڑون پر لکھے ہوئے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے زمانہ مین انکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب کے مطابق مرتب کر کے کتابی شکل مین ایک جگہ جمع کر دیا، اور یہ حقیقت خود عہد صدیقی مین جمع و ترتیب قرآن کی روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے ظاہر ہو جاتی ہے،

یہ کام نہایت مہتم بالشان تھا اس لیے حضرت ابوبکر صدیق نے اس کے لیے ان بزرگون کا انتخاب فرمایا جو جماعت صحابہ مین حفظ قرآن مین ممتاز اور جامع قرآن تھے، اور جنھون نے کتابت وحی کی خدمت بھی انجام دی تھی،

[1] تفسیر در منثور ج ۱ ص ۲۰

حضرت ابی بن کعب اور زید بن ثابت کا نام تصریح کے ساتھ روایتون مین آتا ہے، اور ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور صحابہ بھی شریک تھے، جمع قرآن کی پوری تفصیل کسی ایک روایت میں نہیں ہے بلکہ اس کے مختلف اجزاء مختلف روایتون مین ملتے ہین، سب سے مشہور اور مستند بخاری کی حسب ذیل روایت ہے:-[1]

عن عبید بن السباق ان زید ابن ثابت قال ارسل الی ابوبکر مقتل اھل الیمامۃ فاذا عمر بن الخطاب عندہ قال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامۃ بقراء القرآن وانی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذھب کثیر من القرآن وانی اری ان تامر بجمع القرآن قلت لعمر کیف تفعل شیئا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال عمر ھذا واللہ خیر فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذالک ورایت فی

عبید بن سباق بیان کرتے ہین کہ زید بن ثابت نے کہا کہ ابوبکر نے یمامہ کی جنگ کے بعد جس مین بہت سے صحابہ شہید ہوئے تھے، مجھے بلا بھیجا، مین گیا تو ان کے پاس عمر بن الخطاب موجود تھے، ابوبکر نے کہا کہ عمر نے آکر مجھ سے کہا کہ یمامہ کی جنگ مین قرآن کے بہت سے قاری قتل ہوگئے ہین اگر اسی طرح دوسری لڑائیون مین بھی انکے قتل کا سلسلہ جاری رہا تو مجھے خوف ہے کہ قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا، اس لیے میری رائے ہے کہ آپ قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم دیجیے، مین نے عمر کو جواب دیا کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اسکو تم کس طرح کر سکتے ہو، عمر نے کہا خدا کی قسم یہ اچھا کام ہے، اور مجھ سے بار بار کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کیلیے میرا شرح صدر بھی کر دیا،

[1] بخاری ج ۲ کتاب فضائل القرآن باب جمع القرآن،

ذالک الذی رای عمر قال زید قال ابوبکر انک رجل شاب عاقل لا نتھمک وقد کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتتبع القرآن فاجمعہ فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علی مما امرنی من جمع القرآن قلت کیف تفعلون شیئا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھو خیر فلم یزل ابوبکر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری للذی شرح لہ صدر ابوبکر وعمر فتتبعت القرآن اجمعہ من العسب واللخاف وصدور الرجال حتی وجدت آخر سورۃ التوبۃ مع ابی خزیمۃ الانصاری لم اجدھا مع احد غیرہ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حتی خاتمۃ براءۃ فکانت الصحف

اور مجھکو بھی عمر کی رائے سے اتفاق ہوگیا، زید کا بیان ہے کہ اسکے بعد ابوبکر نے مجھ سے کہا کہ تم جوان اور عقلمند آدمی ہو اور کسی جرم مین متہم بھی نہین ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھتے تھے اس لیے قرآن کو تلاش کرکے اس کو ایک جگہ جمع کرلو، زید کہتے ہین کہ خدا کی قسم اگر مجھے پہاڑ اٹھانے کو بھی کہتے تو وہ مجھ پر جمع قرآن کے حکم سے زیادہ گران نہ گذرتا، مین نے کہا آپ لوگ وہ کام کس طرح کر سکتے ہین جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہین کیا، ابوبکر نے کہا یہ اچھا کام ہے، اور مجھ سے بار بار کہتے رہے تا آنکہ ابوبکر و عمر کی کی طرح اس بارہ مین اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ بھی کھول دیا، اس وقت مین نے کھجور کی بے پتی کی شاخون، پتھر کی تختیون، اور لوگون کے سینون سے تلاش کرکے قرآن کو جمع کرنا شروع کیا، سورہ براءۃ کی آخری آیتین لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم سے لیکر براءۃ کے خاتمہ تک صرف ابوخزیمہ انصاری کے پاس تھیں، یہ صحیفے ابوبکر کے پاس رہا، پھر ان کی وفات کے بعد

عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر حیاتہ ثم عند حفصۃ بنت عمر

عمرؓ کے پاس اور ان کے بعد ان کی لڑکی حفصہ کے پاس ،

دوسری روایت مسند احمد بن حنبل میں ہے :-

عن ابی العالیۃ عن ابی بن کعب انھم جمعوا القرآن فی مصاحف فی خلافت ابی بکر رضی اللہ عنہ فکان رجال یکتبون ویملی علیھم ابی بن کعب فلما انتھوا الی ھذہ الآیۃ من سورۃ براءۃ ثُمَّ انْصَرَفُوا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ، فظنوا ان ھذا آخر ما انزل من القرآن فقال لھم ابی بن کعب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقرأنی بعدھا آیتین لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ الی وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ثم قال ھذا آخر ما انزل من القرآن الخ

ابو العالیہ ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں لوگوں (صحابہ) نے قرآن کو کتابی شکل میں جمع کیا تو کچھ لوگ اس کو لکھتے تھے اور ابی بن کعب لکھاتے تھے، جب یہ لوگ سورہ براۃ کی اس آیت "ثم انصرفوا صرف اللہ قلوبہم بانہم قوم لایفقہون" پر پہنچے تو کچھ لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ یہ قرآن کی آخری آیت ہے جو نازل ہوئی، حضرت ابی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد دو آیتیں اور مجھ کو پڑھائی تھیں "لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم" کی آیات "رب العرش العظیم" تک ، پھر کہا یہ قرآن کا وہ آخری حصہ ہے جو نازل ہوا ....

....

ان دونوں روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتابت کی خدمت حضرت زید بن ثابتؓ کے متعلق تھی، اور لکھوانے کی حضرت ابی بن کعب کے متعلق، اور ان دونوں کاموں کے لیے اس سے بہتر اور موزوں انتخاب نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ حضرت ابی بن کعب جماعت صحابہ میں سب سے بڑے حافظ قرآن تھے، اور حضرت زید بن ثابت عہد نبوی میں کتابت وحی کی خدمت انجام دیتے تھے، اور قرآن بھی جمع کیا تھا، حضرت ابی بن کعب خود اپنا مصحف مرتب کر چکے تھے جس سے مصحف صدیقی کی تدوین میں بڑی مدد ملی ہوگی، اور یہ پورا مصحف اس میں شامل ہو گیا ہوگا،

اوپر کی دونوں روایتوں میں سب سے زیادہ اہم "جمع" اور "صحیفہ" و "مصحف" کے الفاظ ہیں، انہی سے جمع کی نوعیت واضح ہوتی ہے، جمع کی تین ہی شکلیں ہو سکتی ہیں :

(۱) ایک یہ کہ آیتیں اور سورتیں دونوں غیر مرتب تھیں، ان دونوں کی جمع و ترتیب عمل میں آئی،

(۲) دوسری یہ کہ آیتیں مرتب، سورتیں مکمل اور اس حیثیت سے مرتب بھی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جگہوں کی تعیین فرما دی تھی کہ فلاں سورہ کے بعد فلاں سورہ رہے گی، لیکن وہ کتابی شکل میں مدون نہ تھیں،

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ آیتیں مرتب اور سورتیں مکمل تھیں، لیکن سورتوں میں کوئی ترتیب نہ تھی، اور نہ وہ کتابی شکل میں مدون تھیں،

گذشتہ مباحث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آیتوں کی ترتیب الہامی ہے، اور ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرما دیا تھا، اور جب سورتیں مرتب ہوں گی تو لامحالہ ہر سورہ مکمل ہوگی، اس لیے عہد صدیقی میں جمع و تدوین کی پہلی شکل کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی، صرف آخری دو شکلیں ہو سکتی ہیں، اور ان میں سے کسی کے ماننے میں بھی مضائقہ نہیں ہے، اس لیے عہد صدیقی میں یا سورتوں

کی ترتیب اور ان کی کتابی تدوین کا کام انجام پایا یا صرف کتابی تدوین کا جس سے عہد رسالت میں کلام مجید کی تکمیل و ترتیب پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور صحف و صحیفہ اور مصاحف کے الفاظ اس کا ثبوت ہیں کہ اس سے مراد کتابی تدوین ہے، البتہ ان روایتوں سے ایک شبہ ہوتا ہے جسکی تفصیل اور اسکا جواب بعد میں آئے گا،

اوپر کی روایت بہت مجمل ہے، اس سے طریقۂ کار کی نوعیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، دوسری روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کیلیے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے بڑا اہتمام فرمایا تھا، اور جس قدر احتیاطیں ممکن تھیں عمل میں لائی گئیں، اس کی تدوین ابی ابن کعبؓ و زید بن ثابت کے سپرد فرمائی، جو عہد رسالت میں کاتب وحی اور حافظ و جامع قرآن تھے، پھر قرآن کا کوئی حصہ خواہ وہ تحریری شکل میں رہا ہو یا زبانی روایت کی صورت میں بغیر دو معتبر شہادتوں کے قبول نہیں کیا جاتا تھا، حافظ ابن حجر ابن ابی داؤد کے حوالہ سے لکھتے ہیں،

قام عمر فقال من کان تلقی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئاً من القرآن فلیات بہ وکانوا یکتبون ذالک فی الصحف والالواح والعسب وکان لا یقبل من احد شیئاً حتی یشھد شاھدان وھذا یدل علی ان زیدا کان لا یکتفی بمجرد وجدانہ مکتوبا حتی یشھد بہ من تلقاہ سماعا مع کون زید کان یحفظہ وکان یفعل ذالک مبالغۃ فی الاحتیاط (فتح الباری ج ۹ ص ۱۱)

یعنی تدوین قرآن کے وقت حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کا کوئی حصہ حاصل کیا ہو اس کو لا کر پیش کرے، صحابہ اس کو اوراق، پتھر کی تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھ لیا کرتے، کسی سے قرآن کا کوئی حصہ بغیر دو گواہوں کی شہادت کے قبول نہیں کیا جاتا تھا، یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ زید کو باوجودیکہ وہ آیت حفظ ہوتی تھی لیکن محض اس کا لکھا ہونا کافی نہیں سمجھتے تھے، جب تک کہ اس کی شہادت موجود نہ ہوتی کہ لکھنے والے نے رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے) اسکو سنا ہے یہ انکی انتہائی احتیاط تھی،

وعند ابن ابی داؤد ایضاً من طریق ھشام بن عروۃ عن ابیہ ان ابابکر قال لعمر ولزید اقعدا علی باب المسجد فمن جاء کما بشاھدین علی شیٔ من کتاب اللہ فاکتباہ ورجالہ ثقات مع انقطاعہ وکان المراد بالشاھدین الحفظ والکتاب او المراد انھما یشھدان علی ان ذالک من الوجوہ التی نزل بھا القرآن وکان غرضھم ان لا یکتب الا من عین ما کتب بین یدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا من مجرد الحفظ

ابن ابی داؤد نے ہشام بن عروہ سے بھی جنھوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ ابوبکرؓ نے عمرؓ اور زیدؓ سے کہا کہ تم دونوں مسجد نبوی کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو شخص دو شہادتوں کے ساتھ قرآن کا کوئی حصہ پیش کرے تو اس کو لکھ لو، یہ روایت گو منقطع ہے لیکن اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، دو شاہدوں سے مراد یہ ہے کہ وہ حصہ اس شخص کو زبانی یاد بھی ہو اور اس کے پاس لکھا ہوا بھی ہو یا یہ مراد ہو کہ اس کی دو شہادتیں موجود ہوں کہ وہ اسی طریقہ سے نازل ہوا ہے، اس سے ان لوگوں کی یہ غرض تھی کہ بعینہ وہی لکھا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھا گیا تھا، اور محض زبانی یاد کو کافی نہ سمجھا جائے،

دو شہادتیں اس کی ہوتی تھیں کہ مکتوبہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنکر یا آپ کے سامنے لکھا گیا ہے،

بخاری میں حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے کہ جب ہم نے کلام مجید کے متفرق اوراق کو کتابی شکل میں لکھنا شروع کیا تو سورہ احزاب کی ایک آیت جس کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتا تھا، ابو خزیمہ کے علاوہ اور کسی کے پاس لکھی ہوئی نہیں ملی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ان کی شہادت دو شہادتوں کے برابر قرار دی تھی، اس لئے قبول کر لی،[1]

---

[1] بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۂ احزاب ج ۲ ص ۷۰۵،

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت زید بن ثابتؓ کو خود بھی یاد تھی لیکن انھون نے تنہا اپنی یادداشت پر اعتماد نہین کیا، اور جب تک کہ خزیمہ کے پاس لکھی ہوئی نہین ملی، اس کو نہین لکھا۔

دوسری روایت مین ہے

عن عبد اللہ بن زبیرؓ عن ابیہ قال	حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اپنے والد سے روایت
اتی الحارث بن خزیمہ بھاتین	کرتے ہین کہ حارث بن خزیمہ سورہ براۃ کی آخیر کی
الآیتین من آخر سورۃ براءۃ فقال	دو آیتین لائے اور کہا مین شہادت دیتا ہون
اشہد لقد سمعتھما من رسول اللہ	کہ مین نے ان دونون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم ووعیتھما فقال عمرؓ	سے سنا اور یاد رکھا حضرت عمرؓ نے انکی تصدیق کی کہ مین
انا اشہد لقد سمعتھما	شہادت دیتا ہون کہ تم نے دونون آیتین سنی تھین،

ان دونون روایتون سے شہادت کی نوعیت ظاہر ہوتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور زید بن ثابتؓ نے جمع قرآن مین کتنی احتیاط برتی تھی، اصول شہادت کی رو سے تو یہ محض دو ثقہ آدمیون کی شہادت ہوتی تھی لیکن اگر اس کے دوسرے پہلوؤن پر غور کیا جائے، تو انکی قدر و قیمت دو شہادتون سے کہین زیادہ ہے، اولاً صحابۂ کرام کی صداقت کا درجہ خود عام ثقہ لوگون سے بڑھ کر ہے، پھر قرآن کے بارے مین ان کی شہادت جس پر ان کے دین کا مدار تھا، اور جس مین ادنیٰ غلطی سے دین و دنیا دونون کا خسارہ تھا کس درجہ کی ہوگی اور جب تک ان کو حق الیقین اور عین الیقین نہ ہوتا ہوگا وہ اس شہادت کو تصور مین بھی نہ لاسکتے تھے، اس لیے قرآن کے بارہ مین صحابہ کی شہادت کا دنیا کی کوئی شہادت مقابلہ نہین کر سکتی اور اس کی صحت کی اس سے بڑھ کر شہادت دوسری نہین ہو سکتی،

اوپر کی روایتون کے بعض الفاظ سے بظاہر یہ شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر عہد صدیقی مین کلام مجید کی صرف کتابی تدوین ہوئی تو پھر اس عام منادی کے کیا معنی کہ جس نے کلام مجید کا کوئی حصہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے سنا ہو تو وہ اس کو بیان کرے، اور بعض آیات بھی پوچھ پوچھ کر لکھی جاتی تھین، لیکن اس شبہہ کا جواب خود ان روایات ہی مین مل جاتا ہے، درحقیقت یہ انتہائی احتیاط تھی تاکہ کلام مجید کی اس آخری تدوین مین جو ہمیشہ کے لیے ہو رہی تھی کوئی آیت چھوٹنے یا اس مین تغیر و تبدل نہ ہونے پائے، اور اگر کچھ بھول چوک ہوئی ہو تو آخری مرتبہ اس کی تصحیح ہو جائے،

اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ دونون حافظ اور جامع قرآن تھے، اور انھون نے پہلے بھی قرآن مجید جمع کیا تھا، اور وہ محض اپنے حافظ اور تحریری یادداشت سے پورا قرآن مرتب کر سکتے تھے اس مین کسی کی مدد کی ضرورت ہی نہ تھی لیکن انھون نے تنہا اپنی یادداشت پر اعتماد نہین کیا، بلکہ پوری شہادت لینے کے بعد جس کی نوعیت اوپر کی روایات مین مذکور ہے کلام مجید کو قلمبند کیا، حضرت ابیؓ اور زید بن ثابتؓ کے علاوہ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور بہت سے بزرگ حافظ قرآن تھے، ان مین چند نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی کی مدد کے قرآن مرتب کر سکتے تھے، لیکن ایسا نہین کیا گیا، بلکہ پوری جماعت صحابہ کو اس لیئے دعوت دی گئی تاکہ کلام الٰہی کی اس آخری تدوین مین کوئی فروگذاشت نہ رہنے پائے اور یہ نسخہ ہر حیثیت سے کامل ہو،

قرآن کی کتابی تدوین مین تاخیر کا سبب لیکن ان تمام حقائق کے باوجود دلون مین یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب عہد رسالت مین آیتون کی ترتیب ہو چکی تھی اور سورتین بھی مکمل ہو چکی تھین تو پھر اس کی کتابی تدوین مین کیا امر مانع رہا اور عہد رسالت مین یہ کام کیون نہ پورا ہو گیا،

درحقیقت اسلام سے پہلے عربون مین کتابت و تحریر اور کتابی علم و تعلیم کا رواج نہ تھا، ان کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ عرب کی پرانی داستانین، اس کی تاریخ، اشعار و انساب و اخبار عرب سب زبانی یاد رکھتے تھے، چنانچہ اسلام سے پہلے کی عرب کی ساری تاریخ زبانی روایات پر مشتمل تھی، شاعری کا سارا ذخیرہ سینون مین تھا، بلکہ وہ کتابت اور کتابی علم کو ایک طرح کا ننگ سمجھتے تھے، ظہور اسلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

تحریر و کتابت کی جانب توجہ کی، اور اس کی تعلیم و اشاعت کی مختلف تدبیرین اختیار فرمائین، اور جس قدر کلام مجید نازل ہوتا جاتا تھا اس کو لکھواتے جاتے تھے، لیکن وہ مرتب کتابی شکل مین نہ تھا، بلکہ مختلف چیزون پر متفرق طور سے لکھا ہوا تھا، اور چونکہ آپ کی وفات تک نزول وحی کا سلسلہ جاری رہا جس مین نسخ کا احتمال باقی تھا، اس لیے اس کی کتابی تدوین نہین فرمائی، بہت سے صحابہ بھی قرآن مجید لکھ لیتے تھے، لیکن بہتون نے پرانے طریقہ پر محض حفظ پر قناعت کیا، نظام الدین قمی نیشاپوری اپنی تفسیر مین لکھتے ہین،

"پورا قرآن عہد رسالت مین جمع ہو چکا تھا، اس لیے کہ جو آیت بھی نازل ہوتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاتب وحی کو حکم دیتے تھے کہ اس کو فلان سورہ کے فلان مقام پر لکھ لو، اور جب کوئی سورہ نازل ہوتی تھی تو کاتب کو حکم دیتے تھے کہ اس کو فلان سورہ کے پہلو مین لکھ لو، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی سورہ نازل ہوتی تھی تو کاتب وحی کو حکم دیتے تھے کہ اس کو فلان مقام پر لکھ لو، انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین انصار مین چار آدمیون نے قرآن جمع کیا تھا، ابی بن کعب رض، معاذ بن جبل رض، اور ابو زید رض (یہ روایت اوپر نقل کی جا چکی ہے)

اس زمانہ مین لوگون نے اس کو دو دفتیون کے درمیان (یعنی کتابی صورت مین) مدون نہین کیا تھا، وہ سورتون کی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کرتے تھے، اس لیے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب کوئی سورہ نازل ہوتی تھی، تو وہ اس کو حفظ کر لیتے یا لکھ لیتے تھے، پھر کسی سریہ مین چلے جاتے تھے، اور ان کی عدم موجودگی مین جو کوئی سورہ نازل ہو جاتی تو واپسی کے بعد اس کو لکھتے یا یاد کرتے تھے، اس سے لکھنے مین تقدیم و تاخیر ہو جاتی تھی کچھ لوگ عربون کے پرانے رواج کے مطابق حافظہ پر اعتماد کر کے لکھتے نہ تھے، بلکہ اشعار و انساب کی طرح زبانی یاد کر لیتے تھے، بعض لوگ حفاظت کے خیال سے کاغذ، اونٹ کی ہڈیون، پتھر کی تختیون وغیرہ پر لکھ لیا کرتے تھے، مگر ان کو کتاب مین دیکھ کر پڑھنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی، اس لیے کتابی صورت مین مدون کرنے کی ضرورت محسوس نہین ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب

مہاجرین و انصار لڑائیون کے سلسلہ مین مختلف ملکون مین منتشر ہو گئے، اور بعض لڑائیون مین انکی بڑی تعداد شہید ہوئی اور قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہوا اس وقت انھون نے مصحف یعنی کتابی صورت مین اس کو مدون کیا[۱]"

یہ بھی واضح رہے کہ عہد صدیقی مین بھی کلام مجید کی تدوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے چند ہی مہینون کے بعد عمل مین آئی، ربیع الاول ۱۱ھ مین آپ کا وصال ہوا، اور اسی سال یمامہ کی جنگ ہوئی، اور جنگ کے فوراً ہی بعد قرآن کی تدوین ہوئی، جیسا کہ اوپر بخاری کی روایت مین گذر چکا ہے۔ تاریخون مین بھی اس کی تصریح ہے ابن اثیر مین جنگ یمامہ کے سلسلہ مین ہے[۲]:

فی ھذہ السنۃ (یعنی ۱۱ھ)	اسی سنہ مین (یعنی ۱۱ھ) واقعہ یمامہ کے
بعد وقعۃ الیمامۃ امر ابوبکر	بعد جب اس مین کثرت سے صحابہ شہید ہوئے
بجمع القرآن لما رای من کثرۃ	تو حضرت ابوبکر رض نے اس خوف سے
من قتل من الصحابۃ لئلا	کہ قرآن ضائع نہ ہو جائے اس کے
یذھب القرآن	جمع کرنے کا حکم دیا،

اس لیے اگر بالفرض عہد صدیقی ہی مین آیتون اور سورتون کی تدوین ہوئی ہوتی تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند ہی مہینون کے بعد اس کی تدوین مین کسی تغیر کا احتمال نہین ہو سکتا تھا۔

عہد نبوی مین قرآن مجید کا تعلیمی نظم

عہد نبوی مین قرآن مجید کی جمع و ترتیب کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ نزول قرآن کے ساتھ ہی اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اور آگے چل کر اس کا پورا انتظام قائم ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو اور ان مین جو لوگ قرآن کے عالم ہو جاتے وہ دوسرون کو اسکی تعلیم دیتے تھے،

---

[۱] تفسیر نیشاپوری ج اول ص ۲۳ و ۲۴ بر حاشیہ ابن جریر [۲] ابن اثیر ج ۲ ص ۱۴۰،

یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قائم رہا، اس لیے عہد رسالت کے ابتدائی اور درمیانی دور مین محض قرآن کی تعلیم پورے قرآن کی تدوین کا ثبوت نہین ہے، کہ قرآن اس وقت تک پورا نازل ہی نہین ہوا تھا، لیکن واقعات سے ثابت ہے کہ جس قدر قرآن نازل ہوتا جاتا تھا، اس کی تعلیم بھی ہوتی جاتی تھی، اس لیے نزول قرآن کے آخری زمانہ مین پورے قرآن مجید کی تعلیم ہوتی تھی، اور متعدد صحابہ نے پورا کلام مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا، حضرت ابی بن کعبؓ نے پورے قرآن کی تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، عبد اللہ بن مسعودؓ نے ستر سے زیادہ سورتین آپ سے سیکھی تھین، سالمؓ اور معاذ بن جبلؓ بھی قرائے صحابہ مین تھے، اور ان بزرگون کو قرآن مجید پر اتنا عبور حاصل تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مسلمانون کو ان سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔[1]

ان کے علاوہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے حضرت ابو درداؓ انصاری حضرت عبادہ بن صامتؓ، ابن ام مکتومؓ ابو زید انصاریؓ وغیرہ متعدد صحابہ کا شمار قرا صحابہ مین تھا،

قرآن کی تعلیم مکی زندگی ہی سے شروع ہو گئی تھی، اور بیرونی مسلمانون کی تعلیم قرآن کے لیے مکہ سے قرا بھیجے جاتے تھے، چنانچہ بیعت عقبۂ اولیٰ کے بعد حضرت مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتومؓ اہل مدینہ کی تعلیم کے لیے بھیجے گئے تھے،[2]

ہجرت کے بعد تعلیم کا پورا نظام قائم ہو گیا تھا، اور صفہ کی درسگاہ مین عام دینی تعلیم کے ساتھ قرآن مجید کی تعلیم خاص طور سے ہوتی تھی، اور بڑے بڑے قرا صحابہ اس مین تعلیم دیتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ کا بیان ہے کہ مین نے صفہ کے چند لوگون کو قرآن کی تعلیم دی تھی، انھون نے مجھکو ایک کمان ہدیہ کی تھی۔[3]

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸، باب القراء من اصحاب النبی صلعم [2] بخاری کتاب التفسیر باب سبح اسم ربک الاعلیٰ [3] ابو داؤد کتاب البیوع باب فی کسب المعلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی خود اس درسگاہ مین بنفس نفیس تشریف لاکر لوگون کو تحصیل قرآن کی ترغیب دلاتے تھے، ابن عامرؓ کا بیان ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، ہم لوگ صفہ مین تھے، آپ نے فرمایا تم مین سے کون پسند کرتا ہے کہ وہ ہر روز بطحان اور عقیق (دیہان چراگاہ ہین تھین) جاکر بغیر گناہ اور قطع رحم کیے ہوئے موٹے کوہان والی دو اونٹنیان حاصل کرے، ہم لوگون نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم سب چاہتے ہین، فرمایا تم مین سے کوئی صبح کو مسجد اس غرض سے کیون نہین جاتا کہ وہان تعلیم حاصل کرے اور قرآن کی دو آیتین پڑھے، جو اس کے لیے دو اونٹنیون سے، اور تین آیتین تین اونٹنیون سے اور چار آیتین چار اونٹنیون سے، اور اس سے زیادہ آیتین اس سے زیادہ اونٹنیون سے بہتر ہین،[1]

ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مین (صفہ مین) غریب اور نادار مہاجرین کی جماعت مین بیٹھا تھا، اور ایک قاری قرأت کر رہا تھا کہ اتنے مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، قاری پاس ادب سے خاموش ہو گیا، اور سلام عرض کیا، آپ نے پوچھا تم لوگ کیا کر رہے تھے، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک قاری قرأت کر رہا تھا اور ہم لوگ کتاب اللہ سن رہے تھے، آپ نے (ان غربار کی حالت سے متاثر ہو کر) فرمایا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ایسے لوگون کو میری امت مین پیدا کیا کہ ان کے ساتھ مجھے بھی اپنے نفس پر صبر سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے، یہ فرما کر ہماری جماعت کے درمیان بیٹھ گئے،[2]

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ بن العاص کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے نکل کر مسجد (صفہ کی درسگاہ مسجد سے بالکل ملی ہوئی تھی) تشریف لائے، لوگ دو حلقون مین بیٹھے ہوئے تھے، ایک گروہ تلاوت قرآن اور دعا مین مصروف تھا، اور دوسرا تعلیم و تعلم مین، آپ نے دیکھکر

---

[1] مسلم [2] ابو داؤد کتاب العلم باب فی القصص

فرمایا، یہ سب نیک کام کر رہے ہین، اگر خدا چاہے گا تو ان کی دعا قبول کرے گا، نہ چاہے گا، نہ قبول کریگا، مین معلم بنا کر بھیجا گیا ہون یہ کہہ کر تعلیمی حلقہ مین بیٹھ گئے،[1]

اس درسگاہ کے اکثر معلمین نادار مسلمان تھے، اور محنت مزدوری کے ذریعہ معاش حاصل کرتے تھے، جن کو دن کو موقع نہ ملتا تھا وہ رات کو تعلیم حاصل کرتے تھے انھین قرا، کہا جاتا تھا، اور جہان دینی تعلیم کی ضرورت اور طلب ہوتی وہان ان کو بھیجا جاتا تھا،

انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ کچھ لوگون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہو کر آپ سے درخواست کی کہ قرآن و سنت کی تعلیم دینے کے لیے چند آدمیون کو ان کے یہان بھیجا جائے، آپ نے ستر انصاری جو قرا، کہلاتے تھے بھیجدیے، یہ لوگ قرآن پڑھتے تھے اور درس و تعلیم مین مشغول رہتے تھے، دن کو پانی لاکر مسجد مین رکھتے اور لکڑیان چن کر بیچتے اور اس سے جو کچھ ملتا اس سے اصحاب صفہ اور دوسرے غربا، کے لیے کھانا خریدتے لیکن ان کو راستہ مین دھوکے سے شہید کر دیا گیا، صرف ایک آدمی زندہ بچا جس نے مدینہ آکر اطلاع دی،[2]

دوسری روایتون مین اس واقعہ کی تفصیل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ کلاب کے رئیس کی درخواست پر آپ نے قرا بھیجے تھے، اور رعل و ذکوان نے ان پر دفعۃً حملہ کرکے شہید کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شہادت کا اتنا غم ہوا کہ ایک مہینہ تک قاتلین کے لیے بد دعا کرتے رہے،

صفہ کی درسگاہ کے علاوہ اور متفرق طریقون سے بھی تعلیم ہوتی تھی، باہر سے جو لوگ حصول تعلیم کے لیے مدینہ آتے تھے ان کو مختلف علما، کے سپرد کر دیا جاتا تھا، اکثر یہ خدمت انصار کرام کے سپرد ہوتی تھی جو تعلیم کے ساتھ میزبانی کا بھی فرض انجام دیتے تھے، چنانچہ قبیلہ عبد قیس کی تعلیم و

[1] ابن ماجہ باب فضل العلماء و الحث علی العلم [2] مسلم کتاب الامارۃ باب ثبوت الجنۃ للشہید

میزبانی آپ نے انصار کے سپرد فرمائی تھی، انھون نے دونون خدمتون کو حسن و خوبی سے انجام دیا، اور آنحضرت صلعم کے استفسار پر وفد کے ارکان نے جواب دیا کہ انصار بڑے اچھے بھائی ہین، ہمارے لیے نرم بستر بچھائے، عمدہ کھانے کھلائے اور ہم کو ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دی، آپ سن کر بہت مسرور ہوئے، اور فرداً فرداً سب کا حال پوچھا، ان لوگون نے جسقدر تعلیم حاصل کی تھی اس کی تفصیل بیان کی،[1]

بعض قبائل کی تعلیم کے لیے خود مدینہ سے معلمین بھیجے جاتے تھے جیسا کہ قرا، کے واقعہ سے ظاہر ہے عرب کے مختلف حصون مین جو حکام اور عہدہ دار بھیجے جاتے تھے یہ سب صحابی ہوتے تھے، اس لیے انتظامی امور کے ساتھ تعلیم کی خدمت بھی ان کے متعلق ہوتی تھی چنانچہ جب حضرت معاذ بن جبلؓ یمن کے قاضی مقرر ہوئے تو اہل یمن کی تعلیم قرآن اور احکام شریعت کی تعلیم بھی ان کے متعلق ہوئی، انھون نے لوگون کو جمع کرکے ان کو اسلام پر استقامت کی تلقین کی، اور قرآن کے مطالب کو سمجھنے کی ترغیب دی، اور کہا جب قرآن سمجھ لوگے .... تو پھر مین تم کو جنتیون اور دوزخیون کی پہچان بتاؤن گا، چند دنون بعد لوگون نے آکر کہا کہ ہم نے قرآن سمجھکر پڑھ لیا ہے، اب آپ ہم کو جنتیون اور دوزخیون کی پہچان بتائیے، آپ نے فرمایا جس کا لوگ بھلائی سے تذکرہ کرین وہ جنتی ہے، اور جس کا برائی سے کرین وہ دوزخی ہے،[2]

قرآن کی تعلیم اتنی ضروری تھی کہ بچون اور عورتون کو بھی اس کی تعلیم دیجاتی تھی ابودرداءؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا جب لوگون سے اس طرح علم چھین جائے گا کہ بالکل باقی نہ رہے گا، زیاد بن لبید انصاری نے عرض کیا کہ ہم سے علم کس طرح چھن سکتا ہے جب کہ ہم خود قرآن پڑھتے ہین، اور اپنی عورتون اور بچون کو اس کی تعلیم دیتے ہین، اس پر فرمایا زیاد تم مدینہ

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۳ ص ۴۳۲ [2] استیعاب تذکرہ معاذ بن جبل [3] مسند دارمی باب الاقتداء بالعلماء

کے فقیہ ہوکر ایسی باتین کرتے ہو، کیا توراۃ و انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود نہیں ہین، لیکن ان سے ان کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے[1]، یعنی اصل چیز ان کی تعلیم پر عمل ہے،

حدیث کی کتابون مین بکثرت ایسی روایات ہین کہ اگر ان سب کو جمع کر دیا جائے تو ان سے اس دور کا پورا تعلیمی نظام معلوم ہوسکتا ہے، لیکن ہمارا مقصد ان سب کا استقصا نہین بلکہ صرف عہد نبوی مین قرآن کی تعلیم کا اجمالی ذکر دکھانا مقصود ہے کہ خود عہد نبوی مین جس کتاب کی تعلیم کا اتنا مکمل انتظام رہا ہو وہ یقیناً اس زمانہ میں ہر حیثیت سے مرتب اور مکمل رہی ہوگی، اور اس کی کوئی آیت چھوٹنے نہ پائی ہوگی،

نوٹ:- اوپر ہم نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ ابن ندیم اور سیوطی دونون نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کے مصحف کی سورتون کے نام اور انکی ترتیب نقل کی ہے، اور ابن ندیم نے ان کے آخر مین انکی مجموعی تعداد بھی بتادی ہے، کہ ابن مسعود کے مصحف مین ۱۱۰، اور ابی کے مصحف مین ۱۱۶ سورتین ہین، لیکن ابن مسعود کے مصحف کی جتنی سورتین انھون نے نقل کی ہین وہ اس میزان سے مطابقت نہین کرتین، اسی طریقہ سے سیوطی کی نقل کردہ فہرست مین بھی سورتون کی تعداد کم و بیش ہے، مگر اتنا سب کو مسلم ہے کہ ابن مسعود کے مصحف مین ۱۱۰، اور ابی بن کعب کے مصحف مین ۱۱۶ سورتین تھین، آخر الذکر کے متعلق معلوم ہے کہ ان کے مصحف مین خلع اور حفد دو سورتین زیادہ ہین، اور عبد اللہ بن مسعود کے مصحف مین بھی تین سورتون کی کمی کا سبب ظاہر ہے کہ وہ سورہ فاتحہ اور معوذتین کو قرآن کی سورت نہیں سمجھتے تھے، لیکن چوتھی سورت کی کمی کا سبب راقم کی نظر سے نہین گذرا، اگر ان کے مصحف کی کوئی صحیح فہرست مل جاتی تو معلوم ہو جاتا، اگر کسی صاحب علم کی نظر سے اس کے متعلق کوئی روایت گذری ہو تو امید ہے کہ وہ مطلع فرمائیں گے،

---

[1] ترمذی کتاب العلم باب فی ذہاب العلم،

عہد اسلامی کا ہندوستان

مملوک سلاطین دہلی

از مولانا سید ریاست علی ندوی

(۲)

سلطان رکن الدین فیروز شاہ
شعبان ۶۳۳ھ تا ۶۳۴ھ

التمش نے اپنی زندگی میں اپنی جانشینی کے مسئلہ کو کسی قدر پیچیدہ بنادیا تھا، اگا اصول کے مطابق اس نے اپنے بیٹے فیروز کو امور مملکت میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھایا، ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں اس کو بدایوں کے صوبہ کی گورنری دی مگر اس کے طور طریقے ایسے تھے کہ وہ اس کی نظر میں اس کی جانشینی کے لائق قرار نہ پاسکا،

رضیہ کی جانشینی کا پس منظر

اس لئے اس نے ایک دوسرے موقع پر فیروز کی موجودگی میں گوالیار کی مہم پر جاتے ہوئے اپنی بیٹی رضیہ کو دہلی کی زمام حکومت سپرد کی، اور واپس آکر وزیر اعظم تاج الملک محمود سے کہا کہ وہ رضیہ کی ولیعہدی کا اعلان کردے، اگرچہ ترکوں میں نامور حکمراں خواتین گذر چکی تھیں، مگر ہندوستان کی روایات کا لحاظ کرکے ترک افسروں نے دبی زبان سے اس تجویز سے اختلاف کیا، مگر التمش نے یہ کہکر انھیں خاموش کردیا کہ اس کے بیٹے فیروز میں سلطنت کا بار گراں سنبھالنے کی صلاحیت نہیں، انھیں خود تجربہ ہوجائے گا کہ رضیہ اپنی دانشمندی اور تدبر سے اس منصب کی اہل ثابت ہوگی، چنانچہ ۶۲۹ھ میں اس کی ولیعہدی کا اعلان ہوگیا، اور اس کے نام کا سکہ بھی اس کی زندگی میں جاری کردیا گیا، اور فیروز کو عین الملک محمود کی نگرانی میں جس نے رضیہ کی ولیعہدی کی مخالفت کی تھی، لاہور کی صوبہ داری پر بھیج دیا، اور اس طرح گویا اس کو دار السلطنت سے دور کرکے پایہ تخت کو آیندہ پیش آنے والے خطرہ سے بچایا گیا، مگر فیروز کی ماں ترکان خاتون بھی بڑی ہوشمند

ملکہ تھی، وہ فیروز کے حق ولیعہدی سے دست بردار نہیں ہوئی اور ترک افسروں کو اپنا ہم نوا بنالیا۔

رکن الدین کی تخت نشینی

چنانچہ جب التمش آخری مرتبہ لاہور سے واپس آیا، تو فیروز کو اپنے ساتھ لیتا آیا، اس طرح اگرچہ اس کی ولیعہدی کا اعلان نہ ہوسکا، مگر یہ مسئلہ گویا نئے سرے سے ارباب حکومت کی توجہ کا مرکز بن گیا، اور جب التمش نے وفات پائی، تو ملکہ ترکان خاتون اپنے بیٹے کو ترک افسروں کی مدد سے دہلی کے تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہوگئی، اور اس کا لقب رکن الدین قرار پایا،

رکن الدین جیسا کہ التمش کو خطرہ تھا، تخت پر بیٹھتے ہی کاروبار سلطنت سے غافل ہوکر عیش وطرب میں مشغول ہوگیا، شاہی خزانہ کو بے دردی سے برباد کرنے لگا، ترکان خاتون نے سلطنت کی زمام گویا اپنے ہاتھ میں لے لی، سوکنوں کو ہلاک کرایا، ایک سوتیلے بیٹے کی آنکھوں میں سلائی پھروائی اور ملک میں ابتری شروع ہوئی، سلطان رکن الدین کا چھوٹا بھائی غیاث الدین محمد اودھ کا حاکم تھا، اس نے اطاعت سے انحراف کیا، لکھنوتی سے آنے والے شاہی خزانہ کو اودھ میں روک لیا، اسی طرح بدایوں، لاہور، ملتان، اور قلعہ ہانسی کے صوبہ داروں کی باہمی مراسلت سے رکن الدین کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا گیا، سلطان رکن الدین ان خودسروں کو سزا دینے کیلئے دہلی سے نکلا، ان گورنروں کی فوج مقابلہ کے لئے آئی، اس اثنا میں خود رکن الدین کی فوج کے چند افسر غیر ممتاز ساتھیوں کو قتل کرکے دہلی لوٹ آئے، اب رضیہ نے اپنے لئے فضا سازگار دیکھی وہ شجاعت سے مظلوموں کا لباس پہن کر جامع مسجد میں آئی، التمش کی مہربانیاں یاد دلائیں، اور کہا کہ وہ بھائی کے قصاص کیلئے اٹھی ہے، ایک بھائی نے اس کے دوسرے بھائی کو مار ڈالا ہے، فضا رکن الدین کے خلاف ہوچکی تھی، التمش کا رضیہ کو ولیعہد بنانا لوگوں کو یاد آیا، اور افسروں نے یہ کہکر کہ اگر یہ بھائیوں سے بہتر ثابت ہوئی تو تاج وتخت کی یہ مالک رہے گی، اس کو تخت پیش کرکے تاجدار بنا دیا، ترکان خاتون کو گرفتار کرکے قید کردیا گیا، رکن الدین نے یہ حال سنکر دہلی کا رخ کیا تو سلطانہ رضیہ نے پیش قدمی کرکے اس کو شکست دی اور قید خانہ میں ڈال دیا، رکن الدین فیروز صرف ۶ مہینے آٹھ دن حکمراں رہا، اور

ہندوستان میں پہلی مسلمان خاتون صاحب تاج وتخت بنی۔

سلطانہ رضیہ
۶۳۴ھ تا ۶۳۷ھ
۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۰ء

سلطانہ رضیہ نے مردانہ لباس پہنکر بے نقاب تخت سلطنت پر جلوس کیا اور تدبر وہوشمندی سے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی، سلطان رکن الدین کو شکست صوبائی گورنروں کے ہاتھوں ہوئی تھی، وہ بڑھتے ہوئے دہلی تک چلے آئے، اب وہ سلطان کی نامزدگی کو اپنا حق تصور کرنے لگے، اور وہ دربار دہلی کے امرار کی رائے سے اتفاق نہ کرسکے، اس طرح ارباب سیف کے دو مستقل گروہ قائم ہوگئے، صوبہ داروں کے گروہ میں سے اودھ کے حاکم نے رضیہ کی حمایت کرنی چاہی، مگر وہ گرفتار کرکے قتل کردیا گیا، سلطانہ نے شہر سے نکل کر جمنا کے کنارے خیمہ لگایا، دوسری طرف ترک امرا بھی دو گروہوں میں بٹ گئے، مگر رضیہ کے حسن تدبیر سے مخالفین کو شکست ہوئی، ان گورنروں میں سے اکثر مارے گئے، اور کچھ روپوش ہوگئے، رضیہ نے پورا تسلط قائم کرکے حکومت کے نظم ونسق پر توجہ کی، مختلف صوبوں میں گورنر بھیجے، اور لکھنوتی سے دیول وسندھ تک کا علاقہ اس کا مطیع ومنقاد ہوگیا،

رضیہ نے تین سال تک امن وامان کی حکمرانی کی، بعض قلعے جو پہلے سے قبضہ سے نکل گئے تھے، وہاں مہم بھیج کر ان پر قبضہ کیا، وہ امور جہانداری سے بخوبی واقف تھی، مردانہ لباس میں باہر نکلتی، ہاتھی پر سوار ہوکر میدان جنگ میں جاتی، گھوڑے پر سوار ہوتی، عدالت وانصاف کیلئے بیٹھتی تو عادلانہ فیصلے کرتی، لیکن اسلامی ملکوں میں عورتوں کی بادشاہی کا رواج نہ تھا، اس کے کئی بھائی بھی موجود تھے، اس کے خلاف شورش پیدا کرنے کیلئے محض کوئی بہانہ چاہئے تھا، دربار میں ترک افسروں میں سے اس کا ایک مخالف گروہ جو اگرچہ کمزور ہوچکا تھا، مگر پھر بھی موجود تھا، اس کے دربار میں رفتہ رفتہ ایک حبشی جمال الدین یاقوت کو اقتدار حاصل ہوگیا تھا، ترک ملک وامرار کو اس کا اقتدار ناگوار گذرا، وہ اگرچہ سلطنت کے سارے کام مردانہ شجاعت سے انجام دیتی تھی، مگر اس کی نسوانیت بہرحال آ

---

۱ فرشتہ ج ۱ ص ۶۸، فتوح السلاطین عصامی ص ۱۲۶، ۱۲۷، طبقات ناصری ص ۱۸۰ تا ۱۸۵، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۰۰ تا ۷۰۲، ۷۰۸، ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۲۵، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۰۶ تا ۱۱۰، تاریخ ہندوستان ذکار اللہ ج ۱ ص ۲۰۳ تا ۲۰۵۔

میں موجود تھی، اور اس کے مخالفین کے پاس اس کے خلاف بھڑکانے کیلئے یہ آسان حربہ موجود تھا، چنانچہ اندر اندر اس کے خلاف تحریک ہوئی اور وہ ایک شورش بن کر اٹھی، یاقوت حبشی گرفتار کرکے قتل کیا گیا، اور رضیہ کو جبکہ وہ بھٹنڈہ پر فوج کشی میں مصروف تھی، خود اس کے ہمراہیوں نے سازش سے گرفتار کرکے بھٹنڈہ میں قید کر دیا، اس نے بھٹنڈہ کے قلعہ دار سے شادی کرکے وہاں سے نکلنے اور ککھروں اور جاٹوں کی مدد سے دہلی پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکی، آخر دہلی کے اطراف میں ماہ ربیع الاول ۶۳۷ھ قتل کر دی گئی، اس کو تین سال چند مہینے حکمرانی کا موقع مل سکا[1]

معز الدین بہرام شاہ
۶۳۷ھ – ۶۳۹ھ / ۱۲۴۰ – ۱۲۴۲

اس وقت دہلی اور اس کے نواح میں سلطنت کے خلاف ساز باز کرنے میں سازش کرنے والوں کے کئی گروہ قائم ہو گئے تھے، چنانچہ رضیہ کی گرفتاری کے بعد التمش کے بیٹے بہرام شاہ کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا، اس نے معز الدین لقب رکھا، ترک امراء اور ملک اپنی فوجیں لیکر پایہ تخت میں اطاعت کا حلف دینے کیلئے آئے، اور معز الدین نے اقتدار اعلیٰ کی کمان ان کے ہاتھ میں دیدی اور ان کے رحم وکرم پر دہلی کے تخت کا مالک بنا، وزارت کی باگ دو امیروں اختیار الدین اور مہذب الدین کے ہاتھوں میں آگئی، موخر الذکر نے بہرام شاہ کی بہن سے شادی کر لی، اور اختیارات کا زیادہ مالک بن گیا، بہرام شاہ نے اقتدار کو ہاتھ سے نکلتے ہوئے دیکھ کر ان دونوں پر خفیہ حملہ کرایا، اختیار الدین مارا گیا، مہذب الدین زخمی ہو کر بچ نکلا، ایک دوسرا ملک بدر الدین سنقر امیر حاجب مقرر ہوا، اس نے بھی اپنے حدود سے تجاوز کرکے امور مملکت کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر [illegible] لے لیا، اسکے بعد مختلف امراء سازشوں کا جال پھیلانے میں مصروف رہے، یکے بعد دیگرے منصب وزارت پر آئے، یہاں تک کہ ۶۳۹ھ میں جب شاہی لشکر مغلوں کے مقابلہ کیلئے

[1] فتوح السلاطین ص ۱۳۰، طبقات ناصری ص ۱۸۴، ۱۸۵ تا ۱۹۰، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۰۲، ۷۰۵، عصامی ص ۱۲۹، فرشتہ ج ا ص ۶۸، ۶۹، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۰۱ تا ۱۰۳، تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ ج ا ص ۲۰۳ تا ۲۰۵

جا رہا تھا، منصوبہ باندھنے والوں نے اس کو بادشاہ کے خلاف کر لیا، وہ دلی لوٹ آیا، اور شاہی محل کا محاصرہ کر لیا، صلح کی کوششیں ناکام رہیں، اور بہرام شاہ ماہ شعبان میں گرفتار اور ذیقعدہ ۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) میں قتل کر دیا گیا، وزارت کے منصب پر نظام الملک مستوفی بدستور مامور رہا،

سلطان علاء الدین مسعود
۶۳۹ھ – ۶۴۴ھ / ۱۲۴۱ – ۱۲۴۵

بہرام شاہ کے مخالفین میں ملک عز الدین بلبن کشلو خاں کو امتیاز حاصل تھا، اس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا، مگر دوسرے ترک ملک اور امراء نے شاہی خاندان کے کسی رکن کو تخت نشین کرنے کا فیصلہ کیا اور نظر انتخاب سلطان رکن الدین کے بیٹے مسعود پر پڑی، اسکو قید خانہ سے نکالکر علاء الدین مسعود کے لقب سے تخت نشین کیا گیا، ملک کشلو خاں نے بھی کثرت رائے کی اطاعت کی، اور اپنے دعوی سے دست بردار ہو گیا، اس طرح ترک امراء اور ملک کی جو مختلف پارٹیاں تھیں، ان کی مشترکہ حکومت قائم ہوئی، اصل اقتدار انہی کے ہاتھوں میں رہا، ملک کشلو خاں کا اعزاز سب سے زیادہ کیا گیا، اور اس کو اجمیر، مانڈو، اور ناگور کے اقطاع کی حکومت سپرد کی گئی، اسی طرح مختلف ممتاز ملک مختلف صوبوں کے حاکم بنائے گئے، اور حکومت کی اصل باگ وزارت کے ہاتھ میں رہی جس میں وزارت ونیابت کے عہدوں پر مختلف پارٹیوں کے نمائندے سرفراز تھے، اس طرح بیدار مغز مدبر امراء کے ہاتھوں حکومت کا نظم ونسق خوبی سے سنبھل کر قائم ہو گیا،

بلبن کا اقتدار

کچھ دنوں کے بعد مرکزی حکومت کے وزراء میں ردوبدل ہوا، وزارت عظمیٰ کا قلمدان غیاث الدین بلبن کے ہاتھوں میں آیا، اس نے فوج کی نئی تنظیم کی، اور اب طاقت کا سرچشمہ اس کے ہاتھوں میں آگیا، اور مرکزی حکومت کی پوری صورت حال بدل گئی، اس نے اپنی پارٹی کے معتمد لوگوں کو مختلف منصبوں پر مامور کیا، اور مخالف طاقتوں کی سازشوں اور حزب بندی کے شاخسانوں کو ختم کرنے کیلئے راجپوتوں اور مغلوں کے خلاف اپنی فوجی مہیں شروع کیں، اور حکومت کی ساری توجہ اسی طرف لگا دی[1]

[1] طبقات ناصری ص ۱۹۰ تا ۱۹۷، ۲۵۳، ۲۵۵ ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۰۵ تا ۷۱۰، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۱۴ تا ۱۱۶،

رفتہ رفتہ ترک امراء و ملک کی قوت ٹوٹ گئی، یہاں تک کہ بلبن مغلوں کے حملہ کو کامیابی کے ساتھ روک کر واپس آیا تو شاہی فوج سلطان علاء الدین مسعود کے خلاف ہو گئی اور ۶۴۴ھ/۱۲۴۵ء میں اس کو معزول کر کے اس کے چچا ناصر الدین محمود کو جو صوبہ بہرائچ کا گورنر تھا، بلا کر تخت پر بٹھا دیا گیا، سلطان علاء الدین کی معزولی کا سبب تلاش کرنے میں اس کی عقل و فراست و اخلاق کو داغدار کیا گیا ہے، مگر یہ بیان منہاج سراج صاحب طبقات ناصری کا ہے، جو بلبن کے عہد میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور تھا، اور اس کے علٰحدہ ہونے کے بعد علٰحدہ کیا گیا، دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد نئے سرے سے اس عہدہ پر سرفراز کیا گیا تھا، پھر یہ سمجھنا کہ سلطان چار سال تک سلامت روی سے حکمرانی کرتا رہا، اور پھر ایسے زمانہ میں کہ اس کے عہد میں مغلوں کو نمایاں شکست ہوئی ہو اس کی روش میں اچانک ایسی تبدیلی آگئی کہ اس کی معزولی ضروری قرار پائی، باور کرنا عقل سے بعید ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں امراء کی کشمکش جس طرح جاری تھی، اس میں ایسے حکمراں کا صاحب تاج و تخت رہنا جو دوسرے امراء کے زیر اثر فرمانروائی کر چکا ہو بلبن کے کامل اقتدار کیلئے موزوں نہیں سمجھا جا سکتا تھا، اس لئے بلبن نے ایک نئے چہرہ کی ضرورت محسوس کی اور وہ ناصر الدین محمود کے ذریعہ سے پوری ہوئی،

علاء الدین مسعود کا عہد حکومت

سلطان علاء الدین مسعود لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق سے پیش آتا تھا، عدل و انصاف اور داد و دہش میں اسکو شہرت حاصل تھی، وزیر اعظم نظام الملک مستوفی ۶۴۰ھ میں قتل کیا گیا تو سلطان مسعود نے صدر الملک نجم الدین ابوبکر کو اس منصب پر مامور کیا، جو اس کے آخر دور حکومت تک اس خدمت پر مامور رہا[1]،

سلطان ناصر الدین محمود ۶۴۴ھ - ۶۶۴ھ / ۱۲۴۵ - ۱۲۶۵ء

ناصر الدین محمود نے بلبن کو حجابت عظمٰی کے منصب پر برقرار رکھا، اور "الغ خان" کے خطاب سے سرفراز کیا، اور حکومت کا اقتدار جوں کا توں بلبن کے ہاتھوں میں رہا، اس نے ۶۴۷ھ میں سلطان کی بہن سے شادی کر لی جس سے اس کے اعزاز میں مزید ترقی ہوئی اور

[1] طبقات ناصری ص ۱۹۷ تا ۲۰۱، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۱۰ تا ۱۲،

اس نے نائب مملکت کے عہدہ پر اپنے بھائی کشلو خان کو مامور کیا، اور اسی طرح مختلف عہدوں اور منصبوں پر اپنے آدمی مقرر کر دیئے، ترک امراء بلبن کی حکمت عملیوں سے غافل نہ تھے، وہ بھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے، ان دنوں ایک نئی طاقت عماد الدین ریحانی کی سرکردگی میں ابھری، یہ ہندوستانی مسلمان تھا، ترکوں نے اس قدیم ہندی نومسلم افسر کے ذریعہ سے جو پہلے بلبن کے معتمدین میں سے تھا، اس کے خلاف مورچہ لگایا، اور سلطان ناصر الدین محمود نے ایک دن اچانک ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں بلبن کے حجابت کے عہدہ سے معزول ہونے اور عماد الدین ریحانی کے مقرر کئے جانے کا فرمان نافذ کیا، اور بلبن کو اس کی جاگیر قلعہ ہانسی میں چلے جانے کا حکم صادر ہو گیا، ریحانی نے برسر اقتدار آتے ہی اہم منصبوں سے بلبن کے آدمیوں کو معزول کر کے اپنے آدمی مقرر کئے، اور اپنا اقتدار قائم کرنے میں مصروف ہو گیا،

لیکن بلبن نے پایۂ تخت سے نکل کر اپنی حکمت عملی سے ان ترک افسروں کو اپنا ہم نوا بنا لیا، جو مختلف صوبوں کے حاکم تھے، اور ان کا متحدہ لشکر کوچ کر کے دلی آیا اور سلطان کو اپنی اطاعت کا یقین دلا کر عماد الدین ریحانی کو معزول کرنے کا مطالبہ پیش کیا، چنانچہ سلطان نے فوجی طاقت کے آگے سپر ڈالی، عماد الدین ریحانی کو معزول کر کے بلبن کو نئے سرے سے حاجب مقرر کیا، اور ریحانی کو پہلے بدایوں پھر بہرائچ بھیج دیا گیا، بلبن نے رمضان ۶۵۲ھ میں وزارت عظمٰی کا قلمدان نئے سرے سے سنبھال لیا،

پھر آگے چل کر سلطان ناصر الدین محمود نے بلبن کو اپنا نائب مقرر کیا، اور کہا "میں تجھے اپنا نائب بناتا ہوں، اور امور سلطنت سونپتا ہوں، کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ کل خدا کے حضور مجھے اور تجھے دونوں کو شرمندہ ہونا پڑے"،

بلبن نے اپنے پرانے آدمیوں کو دوبارہ مقرر کر دیا، چنانچہ صدر الملک نجم الدین پھر وزارت کے منصب پر آگئے، اور ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے،

اب سلطان شاہی محل میں شاہانہ شان و شکوہ سے بیٹھ چکا تھا، اور لوگوں کی نگاہوں سے اسی طرح

اوجھل ہوگیا جیسے کہ اندلس میں خلیفہ ہشام اموی کو منصور عامری نے شاہی محل میں بٹھادیا تھا، یہاں تک کہ دلی کے ایک تاجر نے سلطان کی خدمت میں باریاب ہونے کیلئے کثیر دولت نچھاور کرنا چاہی، مگر اس کو حضوری کا شرف نہ مل سکا، بلبن سلطنت کے سیاہ و سپید کا اندلس کے حاجب المنصور عامری کی طرح مالک تھا، اس لئے سلطان محمود کی حکمرانی کا زمانہ اگرچہ بیس سال تک رہا، مگر اس عہد کی سیاسیات کی پوری تاریخ گویا بلبن ہی کی حکمرانی کی تاریخ ہے،

لیکن امراء کی پارٹی بندی کا سلسلہ پھر بھی ختم نہیں ہوسکا، ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء سے ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء تک کا زمانہ بغاوتوں کے فرو کرنے میں گذرا، عمادالدین ریحانی نے بھی بغاوت کی اور قتل کیا گیا، اسی طرح مرکز میں سیاسی ہل چل سے فائدہ اٹھا کر حاکم بنگال طغرل طغان خاں نے گویا اپنی خودمختاری قائم کرلی تھی، اس نے آگے بڑھ کر کڑا مانک پور اور اودھ کے بعض علاقوں پر قبضہ کرلیا، یہ گویا مرکزی حکومت کیلئے اس کی طرف سے ایک مستقل چیلنج تھا، بلبن نے اودھ کے گورنر تمر خاں کو اشارہ کیا، اور ایسے موقع سے کہ اڑیسہ کی غیر مسلم ریاست جاج نگر سے طغان خاں شکست کھاکر واپس جارہا تھا، کہ تمر خاں ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء میں پایہ تخت لکھنوتی میں داخل ہوگیا، پھر ۶۴۴ھ/۱۲۴۷ء میں تمر خاں اور طغان خاں کی وفات کے بعد ازبک خاں نے خودمختاری کا اعلان کیا، یہاں تک کہ ۶۵۷ھ/۱۲۵۹ء میں ارسلان خاں حاکم کڑا نے اچانک حملہ آور ہوکر بنگال پر قبضہ کرلیا، اسی طرح اودھ، سندھ، پنجاب میں مقامی حالات پیش آتے گئے، بلبن نے دوبارہ قلمدان وزارت سنبھال کر ان سب صوبوں کی سیاسیات پر عبور حاصل کیا، اور یکے بعد دیگرے اپنا اقتدار قائم کیا،

اسی طرح ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء سے ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء تک کے زمانہ میں مختلف غیر مسلم طاقتوں نے جاج نگر، بہار وغیرہ میں اپنی سطوت قائم رکھی، اور اس کو ترقی دینے کی کوشش کی، بہار میں مسلمان حکمرانوں کے اثرات شاہ آباد، پٹنہ، مونگیر اور بھاگل پور وغیرہ میں قائم ہوئے تھے، لیکن جنوبی بہار میں بودھ گیا، رہتاس گڑھ وغیرہ کا وسیع علاقہ غیر مسلم حکمرانوں کے قبضہ میں تھا، اور موقع پاکر ان کی تاختیں مسلم علاقوں پر جاری تھیں، چنانچہ تاج الدین

سنجر کربت خاں بہار میں مارا گیا، لیکن بلبن کے زمانہ تک ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء میں بہار دوبارہ مسلمانوں کے اقتدار میں آگیا تھا اور غیر مسلم طاقتیں کمزور پڑگئی تھیں، اور گیا بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا، چنانچہ ۶۶۶ھ/۱۲۶۸ء میں گیا کے ایک مصنف کی سنسکرت تصنیف میں بلبن کا نام حکمراں کی حیثیت سے آیا ہے، تیرہویں صدی میں گیا کو دوسرے مذہبی مقاموں کی طرح ترکوں کے اقتدار سے نکالنے کی کوشش کی گئی، مگر کامیابی نہ ہوسکی، ترکی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو یہاں کے وہ راجہ بھی قبول کرنے پر مجبور رہے جو خودمختاری سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے، اسی طرح ریوا، کالنجر وغیرہ میں راجپوتوں نے سر اٹھایا، مگر وہ بھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کرسکے، اگرچہ بندیل کھنڈ اور بعض جنوبی قلعوں پر ان کا قبضہ ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء سے ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء تک برقرار رہا، اسی طرح گوالیار، نروا، مالوہ، گجرات، مارواڑ وغیرہ کے بعض علاقوں، پھر اودھ میں قنوج و تارولی وغیرہ میں خودمختار حکومتیں ایک مختصر مدت کیلئے قائم ہوئیں، بلبن نے ان مسلم و غیر مسلم ابھرنے والی طاقتوں کو یا تو اپنی نیابت کے زمانہ میں یا آگے چل کر اپنی بادشاہی کے زمانہ میں زیر کرلیا، اس طرح بلبن اپنے دور کا ایک کامیاب حکمراں تھا،

سلطان ناصر الدین محمود نے ۱۲ جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں وفات پائی، اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی کہ جانشینی کا دعویٰ کرتی، ترک امراء التمش کے زمانہ سے جس طرح جانشینی کا فیصلہ کرتے آئے تھے اسی اصول کے مطابق بلبن نے اپنے کو مستحق سمجھا، اختیارات تو اس کے ہاتھ میں تھے ہی، اس نے بادشاہ کی وفات کے بعد تاجپوشی کی رسم بھی انجام دے دی،

سلطان غیاث الدین بلبن
۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء — ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء

بلبن، سلطان غیاث الدین کے لقب سے تخت پر متمکن ہوا، وہ اسی ترکی قبیلہ البری کا ایک فرد تھا جس سے سلطان التمش کا نسلی تعلق تھا، قسمت نے اس کو جمال الدین کے ہاتھوں ۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء میں التمش کے دربار میں پہنچا دیا تھا، ابتدائی خدمت کے بعد رضیہ کے عہد میں امیر شکار بنا، رفتہ رفتہ ترقی کرکے نائب سلطنت قرار پایا، وہ اگرچہ اس خاندان کا خانہ ساز غلام تھا، مگر ہم نسل ہونے

کی وجہ سے شمسی خاندان سے اس کی رشتہ داری آسانی سے قائم ہوگئی، اور اپنی زندگی کے مختلف دوروں میں آگے بڑھتا ہوا تخت دہلی کا مالک بنا، التتمش نے دہلی سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی، اور یہ بلبن ہی کے سعی میں تھی کہ وہ اس سلطنت کو اعلیٰ استحکام اور ترقی کے عروج پر پہنچا گئے،

اس نے تخت نشینی کے بعد سلطنت کے وقار کو قائم کرنے کیلئے سب سے پہلے فوج کو نئے سرے سے منظم کیا، اعلیٰ عہدوں اور منصبوں میں اپنی پسند کے آدمیوں میں رد و بدل کیا، پایہ تخت کے قریب کے ان جنگلوں کو جہاں سرکش کمینگاہیں بناتے تھے صاف کیا، پایہ تخت کے نظم سے فارغ ہوکر وہ دوآبہ اور اودھ میں آیا، اور سارے علاقہ کو کئی فوجی کمان میں تقسیم کیا، اسی طرح اس نے مختلف دوسرے مقاموں میں جنگلوں سے گذر کر سڑکیں نکالیں، اور پھر موقع موقع سے سرکشوں کو سزائیں بھی دیں، ان حفظ ماتقدم کی تدابیر سے ملک میں امن و امان پیدا ہوا، اور لوگ زندگی کے مختلف کاموں کاشتکاری اور صنعت و حرفت وغیرہ میں امن و سکون سے لگ گئے،

اس کے ساتھ اس نے اپنی حکومت کی داخلی حکمت عملی میں بھی نمایاں تبدیلی کی، اس نے سوچا کہ جب تک مغل غزنی پر قابض ہیں، اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی طاقت ان میں موجود ہے، اس وقت تک ہندوستان کے چھوٹے بڑے جو بھی اس وقت تک خود مختار ہیں، انھیں زیر کرنا اور ان سے لڑائی مول لینا صحیح نہ ہوگا، اس لئے صرف اس علاقہ کو اپنے زیر حکومت رکھا جو پنجاب سے لکھنوتی تک اس کے قبضہ میں موجود تھا،

بنگال کی بغاوت سلطان علاء الدین کے زمانہ میں بنگال میں طغان خاں کے بعد ملک قرابیگ تیمور خاں پھر ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء میں ملک جلال الدین پھر ۶۵۷ھ / ۱۲۵۹ء میں ارسلان خاں اور اس کی وفات کے بعد تاتار خاں یہاں کے والی یکے بعد دیگرے ہوئے، بلبن نے اپنے دور حکومت کے آغاز میں اس کو برقرار رکھا، پھر ۶۶۵ھ / ۱۲۶۶ء اور بعد دیگر ۶۶۳ھ / ۱۲۶۵ء میں اس کو مرکز کی خدمات کیلئے بلالیا، اور اپنے ایک غلام طغرل خاں کو یہاں کی گورنری سپرد کی، اس نے قوت بہم پہنچاکر جاج نگر پر فوج کشی کرکے بیشمار دولت حاصل کی، اس اثناء میں

ملتان پر مغلوں کے حملے شروع ہوگئے، پھر سلطان کی علالت کی خبر موت کی افواہ میں بدل کر مشہور ہوگئی، ادھر مرکزی حکومت نے ہندوستان کے خود مختار حکمرانوں سے چھیڑ چھاڑ جاری نہ رکھنے کا بھی فیصلہ کیا تھا، ان اسباب سے طغرل خاں میں خود مختاری کا حوصلہ پیدا ہوا، اس نے سلطان مغیث الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا، سلطان غیاث الدین کیلئے یہ اطلاع غیر متوقع تھی اس نے اودھ کے گورنر محمد امین کو فوج کشی کا حکم دیا، اس نے شکست کھائی، تو ملک ترمتی کو مامور کیا، اس کو بھی ہزیمت ہوئی، اور کچھ لوگ طغرل سے مل گئے، تو سلطان اپنی پیرانہ سالی کا خیال نہ کرکے خود کمر ہمت چست کرکے اٹھ کھڑا ہوا، دو لاکھ فوج اس کے ہمرکاب ہوئی، سخت سے سخت بارش میں بھی سفر جاری رکھا، لکھنوتی کے قریب پہنچا تو طغرل خاں فرار ہوگیا، سلطان نے کہا جب تک طغرل خاں کی گرفتاری عمل میں نہ آجائے، وہ واپس نہ ہوگا، اس پاس کے غیر مسلم جاگیرداروں نے بھی اس کی تلاش میں مدد دی، اتفاق سے سلطانی فوج کے ایک ہراول دستہ نے اچانک طغرل کو دیکھ لیا، اور وہ فرار ہوا تو تیر کا نشانہ لگ کر گر پڑا، اور سر کاٹ کر سلطان کے پاس لے آیا، سلطان نے لکھنوتی کے بازار میں دو رویہ سولیاں نصب کیں، اور باغی سرداروں، اور طغرل کا ساتھ دینے والوں کو منظر عام پر سولی پر لٹکایا، پھر لکھنوتی کی ولایت اپنے بیٹے بغرا خاں محمود کو سپرد کی، اور وصیت کی کہ وہ دہلی کے بادشاہ کا ہمیشہ تابع فرمان رہے، چاہے بادشاہ دہلی کوئی بیگانہ ہو یا اس کا رشتہ دار، کیونکہ لکھنوتی کا ملک کتنے ہی فاصلہ پر ہو وہ دہلی کے مضافات میں ہمیشہ داخل رہے گا، اس کے بعد دہلی واپس چلا گیا۔

اسی زمانہ میں شاہزادہ محمد ملتان سے آیا تو اس کی ولیعہدی کا اعلان کیا، اور پھر اس کو مغلوں کی خبر رکھنے کیلئے سرحد پر واپس کردیا، کیونکہ سرحد کی حفاظت اہم ترین مسائل میں سے تھی، اس لئے کہ مغل اس وقت ایشیا پر چھاگئے تھے، بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں کو تباہ و برباد کرچکے تھے، ہندوستان کی سمت بھی وہ آئے، مگر ترکوں کی آبدار تلوار نے ان کا منہ موڑ دیا، ہندوستان کی سرزمین کو منگولوں کی پامالی سے بچانے میں بلبن کے اہم خدمات تھے،

منگولوں کا تعلق ہندوستان سے | جس زمانہ میں ہندوستان میں سلطان التمش کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا، وسط ایشیا کے میدانوں کا خانہ بدوش قبیلہ منگول چنگیز خاں کی سالاری میں اٹھا، اور خوارزمی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء میں خوارزم کا بادشاہ جلال الدین بھاگ کر پنجاب میں دریائے سندھ کے کنارے آیا، یہ چنگیز خاں سے یہاں معرکہ ہوا، پھر وہ شکست کھا کر دہلی میں پناہ گزیں ہوگیا، پھر ملتان اور اچھ سے گذر کر ہندوستان سے نکل گیا، اس کے بعد مغلوں کی مستقل یورش کا سلسلہ جاری ہوا، ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء میں وہ لاہور تک آگئے، اور اس کو تباہ کیا، اس طرح ان میں پنجاب کی ملکیت کا دعویٰ پیدا ہوگیا، وہ اپنے حملے کرتے رہے، چنانچہ ۶۵۵ھ ۱۲۵۷ء میں بلبن نے ملتان کو ان کے حملہ سے بچالیا، اور باوجودیکہ یہ خونخوار قوم سارے ایشیا میں تہلکہ مچائے تھی، مگر ہندوستان کی سلطنت کو بلبن کے مضبوط ہاتھوں میں دیکھ کر ہلاکو خاں کو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑا، چنانچہ ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء میں اس کے سفیر ہندوستان میں آئے، بلبن نے ان کا ایسے تزک و احتشام سے استقبال کیا کہ منگولوں کی نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئیں، اگرچہ اس دوستانہ سفارت کا کوئی پائدار اثر نہیں نکلا، مگر انھیں اس کا حوصلہ نہ ہوسکا، کہ وہ دہلی کے تخت پر بھی نگاہ ڈال سکیں، بااین ہمہ وہ پنجاب کے دعوے سے دست بردار نہیں ہوئے، اور اس پر تشدد حملے کرتے رہے، غیاث الدین بلبن نے شاہزادہ محمد کو مقابلہ کیلئے متعین کر دیا تھا، وہ ۶۸۳ھ ۱۲۸۵ء میں جبکہ سندھ و ملتان کا امیر تھا، مغلوں سے ایک لڑائی میں کام آگیا، بااین ہمہ ہندوستانی لشکر نے مغلوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا، یہ فتنہ اگرچہ کچھ دنوں کیلئے دب گیا، مگر پنجاب میں اسکی چنگاری کسی نہ کسی طرح سلگتی رہی،

وفات اور جانشینی | سلطان غیاث الدین کے لئے اس نوجوان بیٹے کی جس کی ولیعہدی کا اعلان بھی کر چکا تھا، موت کا حادثہ ایسا سخت تھا کہ وہ برداشت نہ کرسکا، اور وہ اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ مرض موت میں مبتلا ہوا، بغرا خاں باپ کی عیادت کیلئے آیا، سلطان نے بغرا خاں کو اپنا جانشین بنانا چاہا، مگر وہ بنگال کی پرامن سلطنت پر دہلی کے تخت کو ترجیح نہ دے سکا،

غیاث الدین کو اس کا افسوس ہوا، اور اس نے مقتول شاہزادہ محمد کے بیٹے کیخسرو کی ولیعہدی کا اعلان کیا، مگر غیاث الدین کی وفات کے بعد وزراء کے اشارہ سے کیخسرو پایہ تخت سے ملتان چلا گیا، اور بغرا خاں کے بیٹے معزالدین کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا گیا،[۱]

معزالدین کیقباد ۶۸۵ھ تا ۶۸۹ھ | کیقباد ۱۷ سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا، معزالدین اس کا لقب رکھا گیا، اس کی تخت نشینی بعض امراء کی سازشوں سے عمل میں آئی تھی، ان ہی نے کیخسرو کو فریب دے کر سندھ کی طرف بھگا دیا، اور اپنے اثر و اقتدار کیلئے اس نوعمر کو تخت نشین کیا، دوسرے مقتدر امراء بلبن کی وصیت کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مخالف رہے، مگر سلطنت کا کوئی دعویدار موجود نہ تھا، اس لئے سب نے جبر و اکراہ سے اطاعت کرلی۔

کیقباد جن امراء کے ہاتھوں تخت سلطنت پر بیٹھا، وہ قدرتی طور پر صاحب اقتدار ہوگئے، اور مختلف عہدوں میں ردو بدل ہوا، یوں تو وزارت و نیابت سب ہی عہدوں پر مختلف لوگ مامور کئے گئے، مگر اصل طاقت ملک الامراء فخر الدین کوتوال کے داماد ملک نظام الدین کے ہاتھوں میں آگئی، جو داد بگی کے عہدہ پر مامور تھا، اس نے سلطان کا اعتماد حاصل کرلیا، اور پوری طرح اس کو قابو میں کرلیا، اس کی بیوی شاہی محل میں پہنچ گئی، اور سلطان کی منہ بولی ماں بن کر اندرون خانہ کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، رفتہ رفتہ اس کو خود صاحب تخت و تاج ہوجانیکا خیال پیدا ہوگیا، ملک فخر الدین کوتوال نے اس کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا، مگر وہ اسی دھن میں لگا رہا، سلطان کو عیش و عشرت کی راہ پر لگا دیا، دوسری صورتیں زنجیا

۱؎ طبقات ناصری ص ۲۰۱ تا ۲۲۸ و ۲۸۱ تا ۳۲۴، ۷۷، ۲۳۵، ۲۴۲ تا ۲۴۶، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۷، ۳۵۲، ۳۹۳، ۳۹۹، ۷۰۷، ۲- ظفر الوالہ حاجی دبیر ج ۲ ص ۷۰۳ تا ۷۳۷، دبیر اور دوسرے مورخین نے بلبن کا سال جلوس ۶۶۳ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے، ۶۶۵ھ کا سکہ بنام محمود برآمد ہوچکا ہے، ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۶، ۲۹، فرشتہ ج ۱ ص ۷۴، ۷۵، ۷۷، تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۲۳، ۲۴، ۲۵ تا ۱۲۵، قران السعدین خسرو ص ۸
(باقی حاشیہ صفحہ ۴۳۶ پر)

کیں، کہ انقلاب سلطنت کا موقع ہاتھ آسکے،

اس سلسلہ میں اس کو کیخسرو کی طرف سے کھٹکا تھا، اس نے سلطان کو سمجھا کر اس کے قتل کرانے کا حکم جاری کر دیا، چنانچہ کیخسرو کو دہلی آنے کی دعوت دی گئی، اور راہ میں اس کو فریب سے قتل کرا دیا گیا،

بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات بغرا خاں نے بنگال میں دار السلطنت کے حالات سن کر اپنے بیٹے کی بے راہ روی سے خاندان سے سلطنت کے نکلنے کا خطرہ محسوس کر کے بیٹے کو نصیحت آمیز خطوط بھیجے، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، تو ملاقات کا قصد کیا، لیکن چونکہ اس نے بنگال میں سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا اور ملک نظام الدین نے کیخسرو کو راہ سے ہٹانے کے بعد بغرا خاں کے قصہ کو بھی پاک کرنا چاہا، اس لئے کیقباد کو یہ سمجھا دینا آسان ہوا، کہ وہ اگرچہ باپ ہیں، مگر سلطنت کی راہ میں باپ بیٹے کا رشتہ نہیں ہوتا، اس نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر کے ایک قسم کی بغاوت کی ہے، اور اب دلی کے تخت کی ہوس اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے، کیقباد کے دل میں خطرات پیدا ہو گئے، اس لئے اس نے اثنائے راہ میں اودھ میں سرجو کے کنارے ملاقات کا مقام مقرر کیا، اور نظام الدین کے مشورہ سے لشکر بھی ساتھ لے گیا، بغرا خاں کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ بھی فوجی طاقت کے ساتھ روانہ ہوا، اور سرجو کے دونوں کناروں پر باپ بیٹے کے فوجی پڑاؤ پڑ گئے، نظام الدین کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح ان دونوں میں جنگ چھڑ جائے، اور ملاقات کیلئے پے درپے شرطیں عائد کرائیں، بغرا تدبر اور ہوشمندی سے کام لیکر سب شرطیں منظور کرتا گیا، آخر میں اس نے کہا میں سلطان بلبن کا پسر ہوں، اور دہلی کے تخت کا میں حقدار تھا، مگر وہ میرے بیٹے کے قدموں کے نیچے آگیا ہے، اور وہ میرے باپ کی جگہ بیٹھا ہے، دہلی کے تخت کی عزت سلاطین دیار کرتے آئے ہیں، میں بھی اس کا احترام ملحوظ رکھوں گا، اور ویسی ہی حاضری دونگا جیسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۵) ریاض السلاطین ص ۷۳ تا ۷۵، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۲۰ تا ۱۳۳ و ۱۵۱ تا ۱۵۴، ہسٹری آف اڑیسہ بنرجی ج ۱ ص ۲۶۳، گیا گزیٹیر ص ۲۰۸، نزہۃ الخواطر ۲۱۹، ۱۲۳،

شہنشاہ کے دربار میں پہنچا جاتا ہے، بغرا خاں کی اس تحریر کے بعد ملک نظام الدین کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ حیلہ جوئی سے کام لیکر ان دونوں کی ملاقات کو مزید معرض التوا میں ڈال سکتا، چنانچہ شہنشاہ کے دربار میں بنگال کے "ایسے حاکم" کو جو اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کرنے کی جرأت کر چکا تھا، حاضری کی اجازت عطا ہوئی اور وہ دریائے سرجو کو عبور کر کے شاہی خیمہ میں حاضری دینے کیلئے آگیا، اور دربار میں پہنچ کر اپنی اسی حیثیت کو ملحوظ رکھکر شاہی مراسم ادا کرتا اور حسب دستور زمیں بوس ہوتا آہستہ خرامی سے سلطان کے روبرو بڑھتا گیا، اور بغرا "نگاہ روبرو سلطان جہاں پناہ" کی صدا چوبدار نے لگائی، اور "مخلوق کے گنہگار کو امان" کی آواز بھی بلند کی گئی، بغرا خاں تخت کے سامنے پہنچکر مؤدب کھڑا ہو گیا، اور کیقباد شاہانہ جاہ و تمکنت سے تخت پر متمکن رہا، بغرا خاں اس نظارہ کی تاب زیادہ دیر تک نہ لا سکا، اور وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اب بیٹے کے لئے بھی اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا دشوار ہو گیا، تخت سے اترا اور لپک کر باپ کے قدموں پر سر رکھ دیا، باپ نے اٹھا کر گلے سے لگایا، اور دونوں دل بھر کر روئے، اور اس منظر سے سارے درباریوں پر رقت و گریہ طاری ہو گیا،

اس کے بعد مختلف نشستوں میں باپ نے بیٹے کو نصیحتیں کیں، امور سلطنت کے نشیب و فراز سمجھائے اور اور اخلاق اور دینداری کے درس کی تلقین کی، اس کی نصیحتوں کو مورخین نے قلمبند کیا ہے، ملک نظام الدین اور ملک قوام الدین کو تنہا بلا کر بھی سلطنت کے متعلق مختلف باتیں سمجھائیں، پھر علحدہ طریقہ سے نظام الدین سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی، بغرا خاں کو بیٹے سے دلی تعلق تھا، وہ سلطنت کے شیرازہ کے بھی قائم رکھنے کا خواہش مند تھا، مگر حالات و قرائن سے اس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ دہلی کا تخت اس کے خاندان سے نکلنے والا ہے، اس نے واپسی کے بعد اپنے رفیقوں سے کہا "یہ میرے لخت جگر سے میری آخری ملاقات ہے" واپسی کے رقت آمیز منظر کا نقشہ بھی مورخین نے کھینچا ہے، کیقباد باپ کی نصیحتوں سے کسی قدر متاثر ہوا، سفر کی واپسی میں چند منزلوں تک اس نے شراب نہیں پی، عیش و عشرت کی زندگی بھی ترک کر دی، مگر

ملک نظام الدین نے حسین عورتوں کے مجرے کو پیش کرکے آخر پھر ..... اس کو اسی راہ پر لگا دیا،

ملک نظام الدین کا زوال لیکن نظام الدین کے متعلق بغرا خاں نے اس سے جو کچھ کہا تھا، وہ اس کے ذہن نشین ہو چکا تھا، دہلی پہنچ کے کچھ دنوں کے بعد اس کو باپ کی بات یاد آئی، اس نے نظام الدین کو کیخسرو کی جگہ ملتان کی گورنری پر جانے کو کہا، وہ اصل مقصد سمجھ گیا، اور حیلہ جوئی سے دہلی ہی میں ٹھہرا رہا، کیقباد نے زہر دلوا کر اس کا کام تمام کرا دیا، اس کے بعد ایک خلجی امیر ملک فیروز کو اس نے حجابت کے عہدہ پر مامور کیا، مگر خود اس کی عادتیں جو بگڑ چکی تھیں وہ درست نہیں ہوئیں، رفتہ رفتہ ملک فیروز خلجی کے اقتدار میں اضافہ ہوتا گیا، اس کے ساتھ کیقباد کی غیر محتاط زندگی سے اس کی صحت بھی بگڑ چکی تھی، وہ دفعۃً لقوہ اور فالج میں مبتلا ہوا اور نقل و حرکت سے بھی معذور ہو گیا،

نئے تاجدار کا سوال اب دربار کے امراء کے سامنے دہلی کے آیندہ تاجدار کا سوال تھا، وہ پھر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے، ایک طرف ملک فیروز کی سیادت میں خلجی تھے، یہ بہادر پور میں چلے آئے، دوسرا گروہ ملک ایتمر سرخا کی سرکردگی میں ترکوں کا تھا، وہ کیقباد کے سہ سالہ بچے کیومرث کو شاہی محل سے نکال کر چبوترہ ناصری کے میدان میں چلے آئے، اور ان دونوں گروہوں میں اقتدار اعلیٰ کو ہاتھ میں لینے کیلئے کشمکش شروع ہو گئی،

شمس الدین کیومرث ۶۸۹ھ ۱۲۸۹ء، ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء ملک ایتمر سرخا نے کیومرث کی تاجپوشی کی رسم انجام دی، اور شمس الدین لقب دیا، تین مہینے کے بعد خلجیوں نے ترکوں کا محاصرہ کرکے کیومرث کو چھین لیا، ملک ایتمر سرخا مارا گیا، سرکشوں نے کیقباد کو جو مردہ حال بستر پر پڑا سسکیاں لے رہا تھا بے دردی سے پیٹا، پھر بستر سمیت اٹھا کر جمنا کی لہروں کے سپرد کر دیا،

اب دہلی میں بلبن کے خاندان کا کوئی وارث موجود نہیں تھا، طاقت خلجیوں کے ہاتھ میں آ چکی تھی، چنانچہ انھوں نے خلجی سردار ملک فیروز کو سلطان جلال الدین خلجی کے نام و لقب سے تخت نشین کیا، اور مملوک سلاطین دہلی کی سلطنت

کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

علم و فضل کی ترقی اور اکابر و اعیان رکن الدین فیروز شاہ کے عہد آغاز ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء سے معز الدین کیقباد کے زمانہ کے خاتمہ ۶۸۹ھ ۱۲۸۹ء کی نصف صدی سے اوپر مدت میں بہت سے ممتاز علما و صوفیہ گذرے جن کے روشن کارنامے یہاں کے تمدن کے مختلف شعبوں کو ترقی دینے میں انجام پائے، ان میں سے بہت سے ایسے ممتاز اعیان ہیں، جن کے درخشاں خدمات کا سلسلہ خصوصاً سلطانہ رضیہ کے عہد سے بلبن کے زمانہ تک کسی نہ کسی حیثیت سے جاری رہا، یہ اساتذۂ فن اپنے اپنے مستقر پر بیٹھے تھے، اور اپنی جگہ خود ایک مستقل درسگاہ تھے، سلاطین کے دور میں مستقل مدرسے بھی جاری تھے، جن میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم جاری تھی،

اس دور میں ملک کی علمی و تعلیمی ترقی کا خاص سبب یہ تھا کہ خود سلاطین کو علم و فضل سے دلی لگاؤ قائم تھا، چنانچہ سلطان التتمش کے بعد جو سلاطین تخت دہلی پر آئے، ان میں بیشتر خود صاحب علم و فضل تھے، علماء و صلحا، کی قدر کرتے اور علوم و فنون کی ترقی میں حصہ لیتے رہے، نیز ان میں سے بیشتر سلاطین دیندار تھے، صلحا و مشائخ کا احترام کرتے، اور ان کے ذریعہ رشد و ہدایت کی جو خدمت جاری تھی، اس میں معاون ہوتے، چنانچہ سلطان ناصر الدین محمود کے متعلق مورخین کہتے ہیں، ہر سال قرآن مجید کے دو نسخے لکھا کرتا، عبادت و ریاضت میں وقت گذارتا تھا،[2] سلطان غیاث الدین اپنے دور کا بہترین حکمراں تھا، علماء و فضلاء اور صلحائے امت و مشائخ کا قدر دان و ادب شناس تھا، شیخ برہان الدین بلخی، شیخ سراج الدین سجزی اور شیخ نجم الدین دمشقی وغیرہ کی مجلسوں اور حلقۂ درس میں جانے اور علمی فیوض سے بہرہ اندوز ہونے کا وقت بھی نکالتا تھا، اس کی اس علمی دلچسپی سے اس عہد میں علماء و فضلاء کی منزلت بڑھی، اور علوم کی اشاعت

---

[1] ظفر الوالہ حاجی دبیر ج ۲ ص ۳۸ تا ۵۲، تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۷ تا ۱۷۳، ۱۱۰۰، ۱۲۱ قران السعدین ص ۳۴، ۳۵، ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۷، فرشتہ ج ۱ ص ۸۸، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۰۵ تا ۱۸۸

[2] نزہۃ الخواطر ص ۲۲۹،

کے مواقع پیدا ہوئے، اس کے زمانہ کو "خیر الاعصار" کہا گیا ہے، اس دور میں بڑے بڑے اکابر صلحاے امت و مشائخ موجود تھے، اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کو وہ اپنی سعادت تصور کرتا تھا،[۵]

نیز شاہی خانوادہ کے دوسرے ارکان بھی علم و فضل اور صلاح و تقویٰ کے قدر دان تھے، سلطان غیاث الدین نے اپنے بیٹے شاہزادہ محمد کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا، وہ علوم و فنون اور علما، و صلحاء کا قدر دان تھا، امیر خسرو اور امیر حسن اس کے دامن دولت سے وابستہ تھے، ان کے علمی کمالات اسی دور میں نمایاں ہو چکے تھے، اس نے شیخ سعدی شیرازیؒ کو دو مرتبہ کثیر عطایا بھیج کر ملتان آنے کی دعوت دی کہ وہ ان کیلئے خانقاہ تعمیر کرائے گا، اور جاگیریں وقف کرے گا، مگر شیخ نے ہر مرتبہ اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے معذوری ظاہر کی، فن انشا، و شعر میں بھی اس کو کامل مہارت تھی،، امیر خسرو نے اس کا پر درد مرثیہ لکھا ہے، جو اہل علم میں شہرت رکھتا ہے،[۲]

سلطان غیاث الدین کا بھتیجا امیر علاء الدین محمد بن کشلی خاں دہلوی علم و فضل کی قدر دانی میں اپنے دور میں بے مثال سمجھا جاتا تھا، اس کی داد و دہش کی شہرت سن کر عراق، عرب، مصر، شام و تاتار سے لوگ اس کے در دولت پر آتے اور کامران واپس جاتے تھے،[۳]

سلطان غیاث الدین کا دوسرا بیٹا ناصر الدین محمود معروف بہ بغرا خاں بھی علم و فضل کی قدر دانی میں شہرت رکھتا تھا، ناصر الدین محمود اور معز الدین کیقبادؔ کی تاریخی ملاقات جو دریا کے کنارے ہوئی تھی امیر خسرو کی قران السعدین اسی کی آئینہ دار ہے، بغرا خاں نے ۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء میں وفات پائی، اس دور کے حسب ذیل ممتاز اعیان، قضاۃ، علما، شعراء، مصنفین، اور ارباب خیر و صلاح خاص طور پر لائق ذکر ہیں:۔

قضاۃ و صدر جہاں صدر جہاں یا قاضی ممالک کے عہدہ پر ملک کے نامور اہل علم مامور کئے جاتے تھے، چنانچہ طبقات ناصری کے مشہور مصنف قاضی ابو عمر عثمان بن محمد جوزجانی معروف بہ منہاج سراج

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ا ص ۱۹۲، [۲] ایضاً ص ۲۲۰، [۳] ایضاً ص ۲۲۲

اس منصب پر ۶۵۳ھ/۱۱۹۳ء تک مختلف زمانوں میں سرفراز رہے، منہاج کا تعلق دہلی کی سلطنت سے التمش کے زمانہ میں پیدا ہوا، وہ ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں پیدا ہوئے تحصیل علوم کے بعد ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں اچھ میں آئے، ناصر الدین قباچہ نے مدرسہ فیروزیہ میں درس و تدریس اور اس کے لڑکے بہرام شاہ نے قضاء عسکر کے منصب پر مامور کیا، ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں سلطان التمش نے گوالیار کے امور شرعیہ کا حاکم، قاضی، خطیب اور امام مقرر کیا، ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء تک یہاں خدمت انجام دیتے رہے، سلطانہ رضیہ کے زمانہ میں وہ دلی میں آئے، تو سلطانہ نے مدرسہ ناصریہ دہلی کے اوقاف کا والی مقرر کیا، اور گوالیار کی قضاوت کا منصب بدستور قائم رہا، پھر بہرام شاہ نے دار السلطنت دہلی کا قاضی مقرر کیا، ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء تک وہ اس خدمت پر مامور رہے، مسعود شاہ کے زمانہ میں وہ دہلی سے لکھنوتی گئے، طغرل طغان خاں نے عزت و احترام سے جگہ دی، دو سال کے بعد پھر دہلی واپس آئے، اور ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں بلبن نائب سلطنت نے گوالیار کی قضاوت اور خطابت پر دوبارہ مامور کیا، پھر اسی سال مدرسہ ناصریہ دہلی کا سابق عہدہ بھی انھیں مل گیا، پھر ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء میں صدر جہاں کے منصب پر مامور کئے گئے،

ان کی تصنیفات کا سلسلہ ۶۴۵ھ/۱۲۴۷ء سے شروع ہوا، سب سے پہلے التمش کا رزم نامہ ناصری نامہ کے نام سے لکھا، بلبن نے قدر دانی سے ان کا حوصلہ بڑھایا، اور رفتہ رفتہ مختلف جاگیریں عطا ہوئیں، قاضی منہاج فقہ، اصول، سیر، تاریخ اور شعر میں دستگاہ رکھتے تھے، تصوف کا بھی مذاق تھا، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دربار میں حاضری دیتے تھے، التمش کی شان میں متعدد قصیدے بھی ہیں، طبقات ناصری ۲۳ جلدوں میں لکھی، طبقات ناصری کے نام سے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۴ء میں جو جلد شائع کی ہے وہ اصل کتاب کی انیسویں سے اکیسویں جلد تک پر مشتمل ہے،[۱]

(۲) قاضی جلال الدین کاشانی قاضی ممالک (چیف جسٹس) کے عہدہ پر بہرام شاہ کے زمانہ تک مامور رہے، اس نے ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں ان کو معزول کیا، تو اودھ چلے گئے، اور عہدہ قضا کی خدمت انجام دی،

---

[۱] نزہۃ الخواطر اول حصہ اول ص ۱۷۴،

علاء الدین مسعود نے انھیں دوبارہ طلب کیا، اور ۶۴۱ھ (۱۲۴۳ء) میں سفارت کی خدمت سپرد کرکے لکھنوتی بھیجا، پھر دہلی کے صدر جہانی کے عہدہ پر سلطان ناصر الدین محمود نے ۶۴۷ھ (۱۲۴۹ء) میں دوبارہ تقرر کیا، اسی منصب پر مامور رہ کر [illegible]ھ (۱۲۵[illegible]ء) میں وفات پائی، [1]

(۳) قاضی شمس الدین مارہروی بہرام شاہ کے زمانہ میں مارہرہ کے قاضی تھے، ۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) میں شیخ ایوب ترکمانی کے اشارہ سے بعض الزامات کی بنا پر ان کو ہاتھی کے پانوں کے نیچے ڈالکر بے رحمی سے مار ڈالا، [2]

(۴) شیخ عماد الدین محمد شفورقانی سلطان مسعود کے زمانہ میں ۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) میں دہلی کے قاضی مقرر ہوئے، ۶۴۰ھ میں معزول کرکے بدایوں بھیجے گئے، پھر عماد الدین ریحانی نے اسی سال ماہ ذی الحجہ میں انھیں قتل کرایا، [3]

(۵) قاضی شمس الدین بہرائچی کو سلطان ناصر الدین محمود نے اپنی ولایت بہرائچ کے زمانہ میں یہاں کا قاضی مقرر کیا تھا، جب وہ سریر سلطنت پر بیٹھا تو ۶۵۰ھ (۱۲۵۲ء) میں دہلی بلاکر یہاں کی قضاءت کی خدمت سپرد کی، اور ۶۵۳ھ (۱۲۵۵ء) میں معزول کیا، جب امرا نے اسکے خلاف ۶۵۵ھ (۱۲۵۷ء) میں بغاوت کی تو اس کا اتہام ان پر بھی لگا گیا، اور اسی سال وہ دہلی سے جلاوطن کر دیئے گئے، اور بہرائچ میں سکونت اختیار کر لی، [4]

(۶) قاضی جمال الدین محمد بسطامی کو سلطان ناصر الدین نے ۶۵۳ھ (۱۲۵۵ء) میں شیخ الاسلام کے منصب پر سرفراز کیا، ۶۵۷ھ (۱۲۵۹ء) میں انھوں نے وفات پائی، [5]

(۷) قاضی جلال الدین کاشانی سلطان معز الدین کیقباد کے عہد میں دہلی میں عہدۂ قضا پر مامور تھے، سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے انھیں دہلی سے علیحدہ کرکے بدایوں کی قضاءت پر مامور کر دیا، اور یہی مملوک سلاطین کے دور کے آخری قاضی تھے، [6] (باقی)

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۳۲ [2] ایضاً ص ۶۷، [3] ایضاً ص ۲۷۶ [4] ایضاً ص ۶۷، [5] ایضاً ص ۲۲۶ [6] ایضاً ج ۲ ص ۲۳۔

مصنفت سلاطین اسلام

ابو العباس احمد الملقب بہ قادر باللہ عباسی

از مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

(سلسلۂ معارف اپریل)

خلفاء عباسیہ میں قادر باللہ چوتھا خلیفہ ہے جو تدبیر و سیاست کے علاوہ علم و فضل کے اعتبار سے بھی بلند حیثیت کا مالک تھا، اور اس نے اپنی تحریری یادگار بھی چھوڑی ہے،

نام و نسب — احمد نام، ابو العباس کنیت، قادر باللہ لقب مقتدر باللہ کا لڑکا تھا، ۳۳۶ھ میں یمنی یا دمنہ نام کی ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا، [1]

خلافت اور کارنامے — ۳۸۱ھ میں طائع کے بعد وہ خلیفہ منتخب ہوا، اس وقت اس کی عمر چوالیس سال کی تھی، [2]

قادر بڑا مدبر اور بڑے جاہ و جلال کا خلیفہ تھا، اس کے پیشرو خلفاء کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ گئی تھی، خلافت کا سارا نظام اور اقتدار دیالمہ کے ہاتھ میں تھا، وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے، خلفاء کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی، وہ صرف تبرک کے طور پر تخت خلافت پر بٹھا دیئے جاتے تھے، قادر نے اپنی سیاست اور تدبیر سے خلافت کا کھویا ہوا وقار دوبارہ قائم کیا،

اس کے زمانہ میں بڑے بڑے انقلابات اور واقعات مثلاً دیالمہ کی لڑائی، شیعوں کی شورش، غزنیوں کا عروج وغیرہ پیش آئے، لیکن قادر نے اپنی بیدار مغزی سے سب پر قابو پالیا، اسی کے زمانہ میں غزنویوں کا تعلق خلافت بغداد سے ہوا، غزنوی خاندان کے مشہور حکمراں سلطان محمود غزنوی کو

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۳ و تاریخ بغداد [2] طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۳،

اس نے لوائے حکومت عطا کیا اور اس کو کہف الدولہ کے لقب سے سرفراز کیا۔[۱]

وفات | ۴۲۲ھ میں وہ بیمار پڑا اور ایک سال تک مسلسل بیمار رہا، ذی الحجہ ۴۲۲ھ میں انتقال کیا، اس وقت اس کی عمر ۸۶ سال کی تھی، مدت خلافت ۴۱ سال، حکومت کا اتنا طویل زمانہ اس کے پیشرو میں کسی کو نہ ملا تھا۔[۲]

حلیہ | خطیب نے لکھا ہے کہ میں نے اس کو کئی بار دیکھا تھا، وہ نہایت خوش رو اور خوش اندام تھا، ڈاڑھی بھی بہت گھنی تھی، اور اس پر خضاب لگاتا تھا۔[۳]

اخلاق و عادات | قادر اخلاق کے اعتبار سے نہایت حلیم، فیاض، نیک نفس خلیفہ تھا، خطیب کا بیان ہے کہ اس کی سیاست، دینداری، تہجد گذاری، نیکیاں اور صدقات و خیرات کی کثرت اتنی مشہور تھیں کہ ان سے ہر شخص واقف ہے،

صدقات و خیرات کا وہ اسقدر اہتمام کرتا تھا کہ اپنے افطار تک کے تین حصے کرتا تھا، ایک حصہ اپنے لئے رکھتا تھا اور دو حصے جامع رصافہ اور جامع بغداد کے مسکینوں کیلئے بھیجتا تھا،[۴]

علم و فضل | علمی اعتبار سے اس کا شمار اس وقت کے علما میں تھا، اپنے زمانہ کے مشہور عالم ابو بشر ہروی شافعی سے اس نے فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی، سبکی نے "طبقات الشافعیہ" میں شافعی علماء کے زمرہ میں اس کے حالات لکھے ہیں، حافظ ابن کثیر البدایہ و النہایہ میں اس کے علم و فضل کے متعلق لکھتے ہیں

وکان الخلیفة القادر باللّٰه من	خلیفہ قادر باللہ بہترین خلفاء اور
خیار الخلفاء وسادات العلماء	ممتاز علماء میں تھا، (ج ۱۱ ص ۳۰۹)

[۱] تاریخ اسلام شاہ معین الدین احمد صاحب جلد ۴ ص ۶۴ [۲] تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۸ [۳] ایضاً [۴] ایضاً،

سیوطی لکھتے ہیں،

وراس الخلفاء القادر باللّٰه	قادر باللہ سر خیل خلفاء تھا، کیونکہ ان میں
فانه من علمهم تفقه وصنف	سب سے بڑا عالم تھا، اس نے تفقہ حاصل
وناهيك بان الشيخ تقي الدين	کی تھی، ایک تصنیف بھی کی ہے، اس کے
عده من الفقهاء الشافعية	علم و فضل کیلئے یہ شہادت کافی ہے کہ تقی الدین
(تاریخ الخلفاء ص ۴۲۲)	سبکی نے اسکو فقہائے شافعیہ میں شمار کیا ہے،

تصحیح عقائد | مختلف مذاہب اور اقوام کے اثر سے بغداد ہر قسم کے عقائد و خیالات کا مرکز بن گیا تھا جن سے مسلمان بھی متاثر ہو گئے تھے، قادر نے ان کے عقائد کی تصحیح کی سعی بلیغ کی، ۴۰۸ھ میں اس نے محمود غزنوی کو احیائے سنت کا حکم دیا، محمود میں خود مذہبی جوش تھا، اس لئے اس نے نہایت سختی سے اس حکم کی تعمیل کی،[۱]

تصنیف | قادر نے تصحیح عقائد کیلئے "اصول اسلام" میں خود ایک کتاب لکھی جس میں محدثین کے مسلک کے مطابق صحابہ کرام کے فضائل، ترتیب کے ساتھ تھے، اس میں اس نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو شامل کر لیا تھا، اور معتزلہ اور خلق قرآن کا عقیدہ رکھنے والوں کی تکفیر اور تفسیق کی تھی، یہ کتاب ہر جمعہ کو جامع رصافہ اور جامع بغداد میں محدثین کے حلقہ میں پڑھی جاتی تھی، لوگ جوق در جوق اس کی سماع کے لئے آتے تھے،[۲]

خطیب اور سبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نثر میں لکھی گئی تھی، دونوں حضرات لکھتے ہیں،

وصنف کتاباً فی الاصول [illegible] — اس نے اصول میں ایک کتاب تصنیف کی [illegible]

[۱] ابن اثیر ج ۹ ص ۱۴۴ [۲] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۸، طبقات الشافعیہ [۳] ایضاً

لیکن حافظ ابن کثیر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب نظم میں تھی، وہ لکھتے ہیں،

وصنف قصیدۃ فیھا فضائل الصحابۃ	اس نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس میں صحابہ
وغیرھا وکانت تقرأ فی حلق	کے فضائل تھے جو جامع مہدی میں ہر جمعہ کو
اصحاب الحدیث کل جمعۃ	محدثین کے مجمع میں پڑھا جاتا تھا،
فی جامع المھدی (البدایہ ج ۱۱ ص ۳۰۹)	

ہو سکتا ہے کہ کتاب نثر میں لکھی گئی ہو بعد میں آسانی کیلئے نظم بھی کر دیا ہو حافظ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) انکی اس تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں،

لہ مصنف فی السنۃ وذم	اس کی ایک تصنیف سنت کی توجیہ اور معتزلہ
المعتزلۃ والروافض	اور روافض کی مذمت کے بارے میں
(دول الاسلام ج ا ص ۱۹۵)	ہے،

ملک شاہ

سلجوقی خاندان کا دوسرا فرمانروا ملک شاہ اپنے اوصاف و خصوصیات اور ملک گیری اور ملک داری میں نہ صرف سلجوقی سلاطین بلکہ دنیا کے ممتاز حکمرانوں میں تھا،[۱] ابن خلکان کا بیان ہے کہ وہ اپنی سیرت کے لحاظ سے دنیا کے بہترین سلاطین میں تھا، اور "سلطان عادل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اس کی سلطنت کا رقبہ طول میں چین سے بیت المقدس اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک تھا،[۲]

عماد الدین اصفہانی لکھتا ہے کہ ملک شاہ عادل، شجاع، حوصلہ مند اور صائب الرائے بادشاہ تھا

۱؎ تاریخ اسلام ج ۴ ص ۱۰۵، ۲؎ ایضاً ص ۱۳۴،

فرماں روا تھا، وہ شام اور انطاکیہ سے قسطنطنیہ کی سرحد تک پہنچ گیا، اور رومی ملکوں سے ایک ہزار دینار سرخ وصول کئے، اور یہاں پچاس اسلامی منبر نصب کئے،[۱]

سلطنت کی توسیع کے ساتھ اس کو علمی و تمدنی حیثیت سے بھی ذروۂ کمال تک پہنچا دیا، راوندی کا بیان ہے کہ ملک شاہ کے اسلاف نے جہانگیری کی اور اس نے جہانداری،

رعایا کی آسایش اور سہولت کے لئے بہت سے کام انجام دیئے، اپنے حدود سلطنت میں ہر قسم کے تجارتی ٹیکس موقوف کر دیئے، سارے ممالک محروسہ میں سڑکیں نکلوائیں، گذرگاہوں پر سرائیں اور دریاؤں پر پل تعمیر کرائے، ۴۸۵ھ میں بغداد کے اندر ایک عالیشان جامع مسجد تعمیر کرائی،[۲] مکہ معظمہ کے راستہ میں جا بجا پانی کے ذخیرہ کے لئے حوض و تالاب بنوائے،[۳] حاجیوں سے جو ٹیکس لیا جاتا تھا اس نے اسکے معاوضہ میں جاگیر وقف کر کے ٹیکس بند کر دیا،[۴]

علمی ترقی اس کے عہد میں علم و فن کو بھی بڑی ترقی ہوئی، بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، موصل اور عراق کے تمام شہروں میں مدرسے قائم ہوئے، اسی کے عہد میں نظام الملک کے اہتمام سے بغداد میں مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد پڑی جس میں اس دور کے تمام ممتاز علماء درس کے لئے منتخب کئے گئے، امام ابو اسحاق شیرازی، ابو نصر صباغ، ابن الخطیب شارح حماسہ، ابوالحسن فصیحی، قطب الدین شافعی اور امام غزالی جیسے یگانہ روزگار علماء مختلف اوقات میں اس مدرسہ کی تعلیم و تدریس کی مسند پر بیٹھے، اس نے امام ابو حنیفہؒ کے نام سے بھی ایک مدرسہ قائم کیا،[۵]

اس کے دور کی علمی خدمات کے سلسلہ میں سب سے اہم سیاست نامہ اور زیج ملک شاہی ہے، سیاست نامہ نظام الملک طوسی کی تصنیف ہے، جو نہ صرف اس زمانہ کی بہترین سیاسی کتابوں میں

۱؎ ابن خلکان جلد دوم ص ۱۲۳، دولت آل سلجوق ص ۲۲ ۲؎ ابن خلکان جلد دوم ص ۱۲۳ ۳؎ ابن اثیر ج ۱۰ ص ۷۴ ۴؎ البدایہ ص ۱۴۲ ج ۱۲

ہے، بلکہ آج بھی اس سے ملکی انتظام میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس کا ترجمہ یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے[۱]

زیج ملک شاہی کو مشہور شاعر و حکیم عمر خیام نے اس کے نام پر ترتیب دیا تھا، یہ زیج چھپ چکی ہے[۲]

تصنیف ملک شاہ خود بھی صاحب علم اور اس سے زیادہ علم و فن اور اہل علم اور ارباب کمال کا قدرداں تھا، اس نے سلجوقی حکومت کے جغرافیہ پر فارسی میں خود ایک رسالہ لکھا تھا، کشف الظنون میں ہے،

رسالہ ملکشاہیہ فارسی للسلطان ملک شاہ السلجوقی فی وصف بلادہ ومملکتہ (ج ۱ ص ۸۹۳)	رسالہ ملک شاہیہ فارسی زبان میں ملک شاہ کی تصنیف ہے جس میں اس نے اپنے شہر اور سلطنت کے حالات و اوصاف لکھے ہیں،

۶ شوال ۴۸۵ھ کو اس نے وفات پائی،

محمود غزنوی

محمود غزنوی خاندان کا گوہر شب چراغ تھا، وہ جس حیثیت کا فاتح اور کشور کشا تھا اسی حیثیت کا علم دوست اور علم پرور بھی تھا، وہ خود عالم، شاعر، اور مصنف تھا اور اس کے دربار میں علماء، فضلا کا مجمع رہتا تھا، لیکن اس کی زندگی کا یہ پہلو اس کی ملک گیری اور کشورستانی کی داستانوں کے سامنے اس قدر دھندلا ہو گیا ہے کہ عام طور سے اس کی جانب نگاہ نہیں جاتی،

باپ کا انتقال اور تقسیم سلطنت غزنوی حکومت کی بنیاد امیر سبکتگین نے ڈالی، امیر سبکتگین کے انتقال کے بعد سلطنت کا کچھ حصہ محمود کے قبضہ میں آیا اور باقی پر اس کے بھائی اسمٰعیل

۱ تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی حصہ چہارم ص ۱۳۵ ۲ ایضاً

نے قبضہ کرلیا، محمود نے ایک سال تک کوشش کی کہ تقسیم سلطنت کا معاملہ صلح سے طے ہو جائے لیکن جب اس میں اسے ناکامیابی ہوئی تو اس نے ۳۸۹ھ میں اسمٰعیل کو شکست دیکر پوری سلطنت پر قبضہ کرلیا،

خلافت بغداد سے تعلقات اسمٰعیل کو شکست دینے کے بعد محمود نے خلیفہ قادر باللہ عباسی سے سند حکومت کی درخواست کی، قادر نے اس کو سند حکومت، لوا، خلعت اور یمین الدولہ کہف الاسلام کا لقب عطا کیا، بعد میں دونوں میں کچھ اختلاف ہو گیا تھا، لیکن پھر تعلقات قائم ہو گئے جو آخر وقت تک قائم رہے، چنانچہ ۴۰۸ھ میں قادر نے محمود کو اعتزال اور باطنیت کے فتنوں کے انسداد اور احیائے سنت کا حکم دیا اور اس نے نہایت ہی سختی سے ان فتنوں کو فرو کیا[۱]

محمود کی وفات ربیع الثانی ۴۲۱ھ میں محمود نے وفات پائی، اس وقت اس کی عمر ۶۴ سال تھی اور مدت سلطنت ۳۵ سال، کئی لڑکے محمود، مسعود وغیرہ یادگار چھوڑے،

اخلاق و عادات محمود نہایت دیندار اور پاک طینت تھا، اس کے حدود سلطنت میں علانیہ کوئی برائی یا شراب نوشی نہیں ہو سکتی تھی، لہو ولعب سے نہ خود دلچسپی تھی، اور نہ وہ دوسروں کیلئے اسے پسند کرتا تھا[۲]

علم و فضل جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے محمود علمی حیثیت سے بھی ممتاز فرمانروا تھا، فارسی تو اس کی مادری زبان تھی، اس کی تحریری یادگاروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی بھی جانتا تھا، اور فقہ و حدیث اور عجم و عرب کی تاریخ میں پوری دستگاہ رکھتا تھا، اس کی حدیث دانی کے متعلق ابن خلکان کا بیان ہے کہ

وکان مولعاً بعلم الحدیث وھو یسمع ویستفسر الاحادیث	علم حدیث کا بڑا دلدادہ تھا، اس کا سماع کرتا تھا اور اسکے متعلق علماء سے سوالات کیا کرتا تھا[۳]

۱ دول الاسلام ج ۱ ص ۱۸۹ ۲ البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۳۰ ۳ ابن خلکان ج ۲ ص ۸۶

فقرہ سے اس کی واقفیت کا اندازہ اس کی کتاب سے جس کا تذکرہ آگے آئیگا ہو جائے گا، اہل فارس اور مسلمانوں کی تاریخ پر بھی اس کی نگاہ تھی، چنانچہ جب مجد الدولہ[1] دیلمی والی رے قید کرکے اس کے سامنے لایا گیا تو اس نے دریافت کیا کہ تم نے شاہنامہ جو اہل فارس کی تاریخ ہے، اور تاریخ طبری جو مسلمانوں کے عہد کی تاریخ ہے، پڑھی ہے؟ اس نے کہا ہاں پڑھی ہے، محمود نے کہا کہ لیکن تمھارا حال ان کتابوں کے پڑھنے والوں جیسا نہیں ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ محمود کی نگاہ سے یہ دونوں کتابیں گذر چکی تھیں اس کے علم و فضل کے متعلق ابن اثیر کا بیان ہے کہ

وہ علماء اور اصحاب کمال کا قدر دان تھا، ان کا اعزاز و اکرام اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا تھا، دور دور سے علماء آکر اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے جنھوں نے اس کے لئے کتابیں بھی لکھیں،[2] شیخ محی الدین عبد القادر جواہر مضیہ میں لکھتے ہیں،

"محمود ممتاز فقہا میں تھا، فصاحت و بلاغت میں یگانہ تھا"، (ص ۱۵۷ ج ۲)

ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ

"محمود بڑا ذکی، دور رس اور صائب الرائے تھا، اس کی مجلس علماء و فضلا کا مرجع تھی"، (شذرات الذہب ص ۲۲۰ ج ۳)

اس کی علم دوستی کا اندازہ اس بیان سے ہو سکتا ہے،

اصحاب کمال کی تلاش اور ان کی قدر دانی | جہاں جہاں اصحاب کمال کا پتہ چلتا تھا محمود ان کو غزنین بلا بھیجتا تھا، اس کے بہنوئی ابو العباس مامون فرمانروائے خوارزم کے دربار میں مختلف علوم و فنون کے ارباب کمال جمع تھے، اطباء میں ابن سینا اور ابو الحسن الخمار علمائے ریاضی میں البیرونی اور

[1] مجد الدولہ بنی بویہ کے خاندان کا فرمانروا تھا، مجد الدولہ میں انتظامی صلاحیت بالکل نہ تھی، جب تک اس کی ماں زندہ رہی امور سلطنت دیکھتی بھالتی رہی، اس کے انتقال کے بعد نظام سلطنت بالکل مختل ہو گیا اور بد امنی پھیل گئی، اس نے محمود سے مدد طلب کی محمود نے رے پر خود قبضہ کر لیا، اور مجد الدولہ کو معزول کر دیا (ابن اثیر ج ۹ ص ۲۶۱)

ابو نصر عراق فلاسفہ میں ابو سہل مسیحی دربار خوارزم کی زینت تھے، محمود نے مامون کو لکھ بھیجا کہ تمھارے دربار میں جو فلاں فلاں علماء ہیں استفادہ کے لئے ان کو اپنے یہاں بلانا چاہتا ہوں انھیں بھیج دو، مامون ان ارباب کمال کو جدا کرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن محمود کی خواہش کو رد کرنا بھی اس کے بس میں نہ تھا، اس لئے اس نے ان علماء کو محمود کا خط سنا کر اپنی مجبوری ظاہر کی، خط سن کر البیرونی، ابو الحسن خمار اور ابو نصر عراق غزنین چلے گئے، لیکن ابن سینا اور ابو سہل مسیحی نے جانا پسند نہ کیا، اور محمود کے خوف سے خوارزم چھوڑ دیا،[1]

اس کی علم نوازی اتنا مسلم واقعہ ہے کہ یورپین مورخین جنھیں محمود کو بدنام کرنے میں خاص لطف آتا ہے، اس کی علم دوستی کے معترف ہیں الفنسٹن صاحب کہتے ہیں،

محمود کے فخر و اعزاز کا واقعی سبب یہ تھا کہ وہ سپہ گری اور بہادرانہ زندگی کے باوجود علوم فنون کے ترقی دینے میں بڑا سرگرم تھا، اور یہ اس کے دور کی عجیب و غریب خوبی تھی، اور آج تک کوئی بادشاہ علوم پروری میں اس سے سبقت نہ لے جا سکا، باوجودیکہ محمود نہایت کفایت شعار تھا، مگر علوم و فنون کے باب میں بڑا فیاض واقع ہوا تھا، اس نے خاص غزنین میں ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا، اور مختلف زبانوں کی عجیب و غریب کتابیں جمع کیں، اس مدرسہ کے اخراجات کیلئے اس نے بہت سا روپیہ مقرر کیا، اور طلبہ اور ارباب کمال کے وظائف کے لئے ایک مستقل فنڈ قائم کیا، ایک لاکھ سالانہ محض علماء کے وظائف مقرر کئے، علماء و مشاہیر کے ساتھ اس احترام سے پیش آتا تھا کہ اس کے دار السلطنت میں اتنے ارباب کمال جمع ہو گئے تھے کہ ایشیا کے کسی بادشاہ کو یہ فخر نہ حاصل تھا،[2]

کتبخانہ | جس مدرسہ و کتبخانہ کی طرف الفنسٹن صاحب نے اشارہ کیا ہے بحر الفوائد اور فرشتہ

[1] ابن اثیر ج ۹ ص ۱۳۹، و تاریخ اسلام بحوالہ تاریخ ادبیات ایران ج ۲ ص ۶۹ [2] تاریخ الفنسٹن ترجمہ اردو ص ۵۵۲ ماخوذ تاریخ اسلام جلد ۴ شاہ معین الدین احمد،

میں اس کی تفصیل موجود ہے، بحر الفوائد میں ہے،

سلطان غازی محمود سبکتگین گفت ہمہ مرادہائے جہاں درجہاں یافتم، مگر یک آرزو، دفترہا خواندن وخبرہائے گزشتگاں دانستن پس فرمود تا در شہر غزنین کتب خانہ بساختند چوں شب درآمدے علما را جمع کردے تا بخواندندے

(تنقید شعر العجم)

تاریخ فرشتہ میں ہے،

درجوار آں مسجد مدرسہ بنا نہاد و بنفائس کتب وغرائب نسخ موشح گردانید و بہات بسیار بر مسجد ومدرسہ وقف فرمود[۱]

علمی مجلس اور مباحثے | اپنے دربار کے علما سے فقہ وحدیث اور کلام وغیرہ کے مسائل پوچھتا رہتا تھا، جب اسے کسی فن کے کسی مسئلہ میں کچھ تامل ہوتا تو وہ اس فن کے علما کو جمع کرکے اپنے سامنے ان سے علمی مباحثہ کراتا اور اسے جو مسلک پسند آتا تھا اسے اختیار کر لیتا تھا، چنانچہ استوا علی العرش کے مسئلہ پر مشہور متکلم محمد بن ہیصم اور مشہور محدث وفقیہ القفال مروزی سے مباحثہ کرایا محمد بن ہیصم کا مسلک اسے پسند آیا، اور اسے اختیار کر لیا،[۲]

فقہ میں ابتداً حنفی مسلک رکھتا تھا، لیکن بعد میں شافعی ہوگیا، امام الحرمین نے اس کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ اسے حدیث سے بجد ذوق تھا، وہ اکثر مشائخ حدیث سے سماع اور احادیث کے بارے میں سوالات کیا کرتا تھا، اس تلاش وتحقیق سے اس کو اکثر احادیث امام شافعی کے مسلک کے مطابق معلوم ہوئیں، اس نے دونوں مسلکوں کے علما کو مرو میں جمع کرکے ان سے اپنے اپنے مسلک کی ترجیح کے دلائل دریافت کیے، دونوں نے دلائل پیش کئے لیکن کوئی بات طے

---

[۱] ص ۳۲ مطبوعہ نولکشور [۲] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۰

نہیں پاسکی، آخر میں یہ قرار پایا کہ دونوں مسلک کا ایک ایک آدمی دو دو رکعت نماز پڑھائے، ان کی نماز کے مشاہدہ کے بعد محمود کو امام شافعی کا مسلک حدیث کے زیادہ موافق معلوم ہوا اور اس روز سے وہ شافعی مسلک کا پابند ہوگیا،[۱]

شعر وشاعری | محمود خود بلند پایہ شاعر تھا اور شعر وسخن کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتا تھا یہی وجہ تھی کہ فارسی شاعری کو اس عہد میں بڑی ترقی ہوئی، مشہور ہے کہ اس نے شاعری کا ایک محکمہ قائم کیا تھا اور عنصری کو ملک الشعرا کا خطاب دے کر اس کا افسر مقرر کیا،

بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ چار سو شعرا اس کے دربار سے وابستہ تھے، جن میں احمد عنصری ابو الحسن علی بن قلوغ فرخی، حسن بن اسحاق فردوسی، منوچہری، دامغانی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں

حمد اللہ مستوفی کا بیان ہے کہ "محمود علما وشعرا کا قدر دان تھا، اور ان پر چار لاکھ دینار سالانہ صرف کیا کرتا تھا" (تاریخ گزیدہ ج ا ص ۳۹۵)

ہر نئے شاعر کو دربار میں عزت کے ساتھ جگہ دیتا تھا، اور جب شاعروں کو دیکھتا تو مسرور ہوجاتا تھا، فرخی کہتا ہے،

تو از دیدار مادح ہمچناں شاداں شوی شاہا	کہ ہر گز نیم از اں وامق نگشت از دیدن عذرا
طواف شاعراں بینم بگرد قصر تو دائم	ہمانا قصر تو کعبہ ہست وگرد قصر تو بطحا

شعرا کو بات بات پر انعام دیتا تھا، ایک مرتبہ عنصری کو ایک ہزار انعام دیا، باتوں باتوں میں غزال پر کوئی لطیفہ ہوگیا، محمود نے اس لطیفہ پر غزل کی فرمائش کی، عنصری نے فی البدیہہ ایک غزل کہہ کر پیش کی، محمود نے انعام میں ایک ہزار کا اور اضافہ کر دیا، چنانچہ عنصری کہتا ہے

ہزار بود ہزار دگر ملک بفزود	بیک غزل کہ زمن خواست بر لطیفہ غزال

---

[۱] ابن خلکان ج ۲ ص ۸۶ والبدایہ والنہایہ ص ۳۰ ج ۱۱ [۲] تنقید شعر العجم

فرشتہ کا بیان ہے کہ غضائری کو اس قصیدے کے صلہ میں جس کا مطلع ہے،

اگر مراد بجاہ اندر است وجاہ بمال   مرا ببیں کہ ببینی جمال را بکمال

محمود نے چودہ ہزار درہم عطا کئے تھے،

سلطان نے ایک مرتبہ کسی نو وارد شاعر کو تین ہزار موتی عطا کئے، عنصری اس واقعہ کو ذکر کرکے کہتا ہے کہ "اس فیاضی اور شعراء کی اس قدردانی کی وجہ سے محمود کے دربار میں شعراء کا مجمع لگا رہتا ہے اسکے اشعار یہ ہیں"

بیک عطا سہ ہزار گہر بشاعر داد   کہ آں خزینہ گہے زرد چہرہ گہہ لاغر

نہ شاعری کہ قدیمش ز رنج خدمت بود   نہ نیز ہیچ بدرگاہ او گرفتہ گذر

ازیں سبب در عالیش مجمع شعر است   اگر بود بسفر شاہ یا بود بحضر[1]

شعراء نوازی کے ساتھ خود بھی نکتہ سنج شاعر تھا، شیخ محی الدین عبد القادر نے لکھا ہے

ولہ شعر جید .....   اس کے اشعار اچھے ہوتے تھے،

محمد عوفی نے شاہی شعراء میں دوسرے نمبر پر اس کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

"گلستان نامی ایک کنیز سے اس کو دلی محبت تھی، جب اس کا انتقال ہوا تو محمود نے ذیل کا مرثیہ لکھا،

تا تو اے ماہ زیر خاک شدی   خاک را بر سپہر فضل آمد

دل جو ع کرد گفتم اے دل صبر   ایں قضا از خدائے عادل آمد

آدم از خاک بود خاکی شد   ہر کہ زوزاد باز اصل آمد

محمود نے جس بیماری میں وفات پائی اس کا سلسلہ طویل ہو گیا تھا، تقریباً ایک سال تک بیمار رہا، اس حالت میں جب سے اپنی گذشتہ شان و شوکت، جاہ و جلال اور موجودہ بیچارگی و درماندگی کا خیال آتا

[1] تنقید شعر العجم بحوالہ دیوان عنصری ص ۶۶

تو اس کے دل پر بڑا اثر ہوتا، اور اکثر اوقات وہ رو پڑتا تھا ذیل کے اشعار میں اس نے اس کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے،

ز بیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے   جہاں مسخر من شد چو تن مسخر رائے

گہے بعز و بدولت ہمی نشستم شاد   گہے ز حرص ہمی رفتمی زجائے بجائے

بسے تفاخر کردم کہ من کسے ہستم   کنوں برابر بینم ہمی امیر و گدائے

اگر دو کلۂ بوسیدہ برکشی ز دو گور   سر امیر کہ داند ز کلۂ گدائے

ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست   بسے مصاف شکستم بیک فشردن پائے

چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نکرد   بقا بقائے خدا است و ملک ملک خدائے[1]

تصنیف محمود نے اپنی متعدد علمی یادگاریں چھوڑی ہیں، شیخ محی الدین عبد القادر نے امام مسعود کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

ولہ التصانیف فی الفقہ و   فقہ، حدیث، خطبات اور رسائل میں

الحدیث والخطب والرسائل   محمود کی تصانیف ہیں، اور اس کے شعر

ولہ شعر جید   بھی اچھے ہوتے تھے،

اس کے اشعار کے جو نمونے مل سکے ہیں وہ نقل کئے جا چکے ہیں، مگر حدیث و خطبات اور رسائل میں اس کی علمی یادگاروں کا کچھ پتہ نہیں چل سکا، البتہ فقہ حنفی میں اس نے ایک عمدہ کتاب "التفرید" کے نام سے تصنیف کی تھی، جس کے متعلق شیخ عبد القادر کا بیان ہے کہ "وہ نہایت عمدہ کتاب ہے اس میں فقہ حنفی کے ساٹھ ہزار مسائل ہیں غزنی کے اطراف و جوانب میں یہ کتاب بہت مشہور ہے"[2]

اس وقت تو اس کتاب کے موجود ہونے کا کوئی علم نہیں ہے البتہ فتاوی تاتارخانیہ میں جو آٹھویں صدی کی تصنیف ہے کثرت سے اس کتاب کے حوالے آتے ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی تک یہ کتاب موجود تھی،

[1] لباب الالباب ج ۱ ص ۲۴، ۲۵ [2] جواہر مضیہ ج ۲ ص ۱۵۰

جماعت اخوان الصفا

از جناب صغیر حسن صاحب ایم اے، استاد شعبۂ عربی و اسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی

عربی انشا پردازی کے جو نمونے خلافت عباسیہ کے زریں کارناموں پر مشتمل ہیں، ان میں رسائل اخوان الصفا کو ہر دور میں مقبولیت و خصوصیت حاصل رہی ہے، اور عام طور سے ممالک عربیہ میں ان کی خاص وقعت و نمایاں حیثیت سمجھی جاتی ہے، چنانچہ عصر حاضر کے عربی کے بڑے بڑے ادیبوں، ڈاکٹر طہٰ حسین، احمد زکی پاشا، سید ادیب عباسی وغیرہم نے رسائل اخوان الصفا کو اپنا موضوع بنایا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ انھوں نے اس اعتنا و توجہ سے کام نہیں لیا ہے جس کے رسائل اخوان الصفا بجا طور سے مستحق تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے معلومات مستشرقین یورپ مثلاً سلفستر و ساسی[1]، ڈیٹریصی ڈی بوئر، نوفرک[2] اور گولڈ تسیہر وغیرہم کے نوشتوں سے آگے نہیں بڑھتے، ان میں ڈیٹریصی نے رسائل اخوان الصفا کے ساتھ خاص اہتمام برتا[3]، اور اس کا مطالعہ اس بارے میں سب سے زیادہ گہرا ہے، مگر اس کی بحثیں بھی ناقص و ناتمام ہیں،

رسائل اخوان الصفا کے مطالعہ کرنے والوں میں ڈاکٹر عمر فروخ پروفیسر فلسفۂ اسلام مقاصد کالج بیروت نے حال میں اپنے تحلیلی مطالعہ کے نتائج کو بعنوان اخوان الصفا، شایع کیا ہے،

۱؎ انھوں نے فرنچ زبان میں رسائل اخوان الصفا کا خلاصہ لکھا ہے۔ ۲؎ نوفرک نے برلن سے ۱۸۳۶ء میں ان رسائل کا خلاصہ شائع کیا، اور اخوان الصفا اور ان کی کتابوں سے بحث کی۔ ۳؎ پروفیسر ڈیٹریصی نے اصل رسائل کی اشاعت کے بعد پورے مجموعہ کا خلاصہ 'Makrokosmos' اور 'Mikrokosmos' کے نام سے دو جلدوں میں ۱۸۷۶ و ۱۸۷۹ء میں شائع کیا۔

جس میں انھوں نے جابجا رسائل پر نقد و تبصرہ سے بھی کام لیا ہے، یہ کتاب اخوان الصفا کے فلسفہ کو سمجھنے اور ان کے عقائد و آرا، سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے بڑی کارآمد ہے،

فروری سال رواں کے معارف میں مولانا عبد السلام صاحب ندوی مدظلہ کا بیش بہا مضمون اخوان الصفا شائع ہوا ہے جو زبان اردو میں غالباً پہلی مثال ہے کہ ان رسائل کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے، یوں تو رسائل کا ایک حصہ جو مجموعۂ رسائل کی قسم دوم کا آٹھواں رسالہ ہے، کانپور میں بار بار چھپا، اور عرصہ سے جابجا داخل نصاب ہے[1]، لیکن غالباً سب سے پہلے ۱۸۱۲ء میں پورا مجموعہ بنام تحفہ اخوان الصفا کے نام سے شیخ احمد بن محمد شروانی الیمنی کے زیر نظر کلکتہ میں طبع ہوا، اور پھر بمبئی سے ۱۳۰۶ھ میں شائع ہوا، مگر کسی ہندوستانی نے غالباً رسائل اخوان الصفا کے لکھنے والوں اور اس کتاب کے مضامین کو اپنا موضوع سخن اس سے پہلے قرار نہیں دیا تھا،

اس مقالہ سے ظاہر ہو چکا ہے کہ ان رسائل کے لکھنے والے مختلف اشخاص تھے، اور یہ کارنامہ ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک جماعت کا کارنامہ ہے، سطور ذیل میں اسی جماعت اخوان الصفا کے حالات، عقائد اور مذہب پر خود ان کے رسائل سے مختصر طور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے،

جماعت اخوان الصفا کا قیام جماعت اخوان الصفا کا دعویٰ ہے کہ یہ جماعت عہد نبویؐ سے موجود تھی

۱؎ اس رسالہ کو ایڈٹ کرنے والے احمد بن محمد شروانی الیمنی ہیں جنھوں نے اس ایڈیشن کے شروع میں صفحہ چھ تک مقدمہ لکھا ہے، پھر اصل کتاب 'قال رضی اللہ عنہ' کے بعد سے شروع ہوتی ہے، پورا رسالہ بمبئی ایڈیشن کی القسم الثانی میں الرسالۃ الثامنۃ فی کیفیۃ تکوین الحیوانات و اصنافہا میں موجود ہے جو مجموعہ میں اکیسواں رسالہ ہے، (ملاحظہ ہو ص ۱۳۵ بمبئی ایڈیشن) مقدمہ میں ایڈیٹر نے رسائل اخوان الصفا کو مجهول الحال ابن الجلدی کی تصنیف قرار دیا ہے، اور لکھا ہے کہ ان رسائل کی تعریف میں قاضی اسحٰق العبدی نے بہت مبالغہ کیا ہے، تفتیش سے اب تک ابن الجلدی نیز قاضی اسحٰق العبدی کا حال کچھ معلوم نہ ہو سکا،

اور خود صحابہ و اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے، بلکہ تمام انبیاء اور ازمنۂ ماضیہ کے صلحاء و اتقیاء کا طریق کار وہی تھا جو اس جماعت کا رہا ہے۔[۵]

پھر بعد میں یہ جماعت روپوش ہو گئی، اور اپنی روپوشی اور خفیہ تبلیغ و اشاعت کا سبب یہ بیان کرتی ہے۔[۶]

"اور اس سے پہلے حقانیت والوں کو وہ مصائب پیش نہیں آئے جو ان کے بعد اس گروہ کے متقدمین کو پیش آئے، پھر صاحب شریعت کی غیبت کے بعد آپ کے جلیل القدر اصحاب، جو اقامت شریعت میں ان کے دست و بازو رہے تھے، جیسے حضرت صدیق (اکبرؓ) فاروق (اعظمؓ) ذو النورینؓ وغیرہم قتل ہوئے، اور ان کے خویش و اقارب پر جو مصائب و مظالم توڑے گئے وہ مشہور و متواتر ہیں، یہ وجہ تھی اخوان الصفا کے پوشیدہ ہو جانے کی، اور دوستان و فاکیش کی دولت کے ختم ہو جانے کی، تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس جماعت کے اول، ثانی، اور ثالث کے قیام کی ان اوقات میں جن میں ان کا قیام سزاوار ہو اجازت دے"،

غرض جماعت اخوان الصفا اپنے زعم میں اولین مسلمانوں کی نسل سے تعلق رکھتی ہے، اور اس کا ظہور ارادی یا غیر ارادی طور پر چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی مسیحی) میں ہوا، جہاں تک تاریخی قرائن سے پتہ چلتا ہے، اس جماعت کی نشو و نما عراق اور بصرہ میں ہوئی، زمانہ و مدت کی تعیین البتہ مشکل ہے، ان کا ظہور جیسا کہ ابھی مذکور ہوا چوتھی صدی ہجری کے وسط میں ہوا بعض لوگ ابن الرومی (المتوفی ۲۸۳ھ / ۸۹۶ء) اور ابو الفتح البستی (المتوفی قریباً ۴۰۰ھ / ۱۰۰۹ء) کے اشعار سے جو ان رسائل میں موجود ہیں ان کے عہد کی تعیین کرتے ہیں[۷]، مگر یہ اس لئے قرین قیاس

---

۵ دیکھو رسائل ج ۴ ص ۱۴۵ طبع مصر، ۶ رسائل ج ۴ ص ۱۴۷ طبع مصر ۷ ڈاکٹر عمر فرخ: اخوان الصفا ص ۸۰

نہیں کہ ان اشعار سے صرف رسائل کے عہد تالیف پر روشنی پڑتی ہے نہ کہ جماعت کی تاسیس کے زمانہ پر، پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ رسائل ایک فرد کا کارنامہ نہیں بلکہ ان کے لکھنے والے مختلف افراد ہیں، اس لئے کسی تاریخی شہادت کی موجودگی کے بغیر اس جماعت کے قیام و نشو و نما کو کسی خاص زمانہ کے ساتھ مختص کرنا ادعائے محض اور خلاف عقل ہے۔

اگرچہ اخوان الصفا کی ترکیب اضافی کا استعمال جاہلی اشعار میں نایاب نہیں، مگر بظاہر اس جماعت نے اپنے نام کا اشتقاق آیت پاک "فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" سے کیا ہے، البتہ خود ان کا بیان ہے کہ ان کا نام صفوۃ الاخوۃ سے ماخوذ ہے[۱]، جو درحقیقت لغوی توجیہ ہے،

اخوان الصفا کے مقاصد اس جماعت کی غرض و غایت ممکن ہے کچھ اور رہی ہو مگر رسائل صاف طور پر بیان کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اخلاق کی درستگی، حق کی حمایت، علوم و فنون کی پرداخت، صفائے طینت، خلوص و مودت اور دینی اخوت کی اشاعت، بالفاظ دیگر ان صفات عالیہ کی نشر و اشاعت ہے جو صحابہ کرامؓ اور خود ذات نبوی کا نصب العین تھا، اس کا ثبوت اس عبارت سے ملتا ہے[۲]

"یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ امر جس کی طرف ہم اپنے بھائیوں کو بلاتے اور اپنے دوستوں کو ترغیب دلاتے ہیں، کوئی نئی رائے اور نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ ایک پرانی رائے ہے جس کی جانب بہت سے حکما، فلاسفہ اور فضلا نے سبقت کی ہے، یہ وہی طریقہ ہے جس پر انبیاء علیہم السلام چلے ہیں اور وہی مذہب ہے جس پر انبیاء کے خلفاء اور ائمہ مہدیین عمل پیرا ہوئے تھے اور یہی حکم ان نبیوں کا تھا جنھوں نے ہدایت پانے والوں اور ان علماء کو جو کتاب اللہ کے معانی کی نگہداشت کرتے تھے مسلمان بنایا، ہمارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا یہی طریقہ تھا جس کی وجہ سے ہمارا نام انھوں نے پہلے ہی مسلمان رکھا۔"

---

۱ رسائل ج ۴ ص ۱۷۹، ۱۸۰، ۲۱۹ طبع مصر ۲ ایضاً ج ۴ ص ۱۸۰

قرآن میں یہ ہے کہ لوگ ایک رائے پر مجتمع ہوں اختلاف کو ترک کریں، نفوس میں موافقت پیدا کریں، دلوں کو ایک دوسرے سے مانوس بنائیں، سچی باتوں کے ساتھ خطاب کریں، دلوں میں تصدیق کو جاگزیں بنائیں، ایک دوسرے کی تکذیب نہ کرے، دھوکا نہ دے، نصیحت کرے خیانت نہ کرے، اعتماد سے کام لے، کسی کو بیجا متہم نہ کرے، دوستی کرے حسد نہ کرے، ایک دوسرے کا دوست بنے، کسی سے بغض نہ رکھے، موافقت کرے مخالفت نہ کرے، اتفاق سے کام لے اختلاف نہ کرے، ایک دوسرے کو تقویت پہنچائیں ذلیل نہ کریں باہم مدد کریں تساہل نہ برتیں، صلاح دین پر ایک دوسرے کی مدد کریں، اور سب متحد ہو کر ایک فرد اور نفس واحد کی طرح ہو جائیں، اور اسی طرح شریعت کے طریقہ پر چلیں جس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے،

"ایمان والے ایک فرد ایک نفس ہیں ان کا خون اور انکا مال ایک دوسرے کیلئے مکافات ہے، اور اپنے علاوہ دوسروں کے مقابلہ میں بمنزلہ ایک ہاتھ کے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی نصیحت اور اس کا فرمان ہے کہ

تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ۵ — نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی معاونت کرو اور گناہ و ظلم پر معاونت نہ کرو

نیز ارشاد ہے،

ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم — آپس میں نہ جھگڑو کہ کمزور پڑ جاؤگے اور تمھاری ہوا (طاقت) چلی جائے گی،

نیز فرماتا ہے،

فاصبحتم بنعمته اخوانا — تو تم اسکی نعمت سے بھائی بھائی ہوگئے،

اس جماعت کی خواہش تھی کہ لوگوں میں معرفت خیر و شر[۱]، صلاح دین و دنیا عام ہو[۲]، اس غرض کے حصول کیلئے اس جماعت نے حکما[۳] خصوصاً فیثاغورثیوں[۴] کی اقتدا میں بھی تامل نہیں کیا، اس کو کسی مذہب سے بیر نہیں، بلکہ وہ سارے علوم الطبیعیہ، ریاضیہ، الٰہیہ[۵] اور سارے مذاہب پر نظر رکھنے کی متمنی تھی، اور اس کی خواہش تھی کہ ان کے اخوان تمام علوم سے بہرہ ور ہوں کہ اسی میں ان کے نزدیک نجات و فلاح ابدی ہے[۶]،

البتہ ہر ہر رسالہ میں اور ہر مناسب مقام پر تنبیہ کرتے جاتے ہیں کہ جو کچھ بیان ہوا محض رموز و اشارات ہیں، اور اصل مقصد کو ظاہر کرنا مشکل ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں[۷]،

"اس کلام پر غور و خوض کرو، یہ اسرار عجیبہ اور رموز دقیقہ سے ہے، اور اس میں ایک غرض غامض ہے،۔۔۔۔ تمھارے لئے سر، اور یہ ہے کہ اپنے بھولنے والے اور سوئے ہوئے نفس کی طرف توجہ کرو، اور غفلت سے جاگو، اور جو کچھ ہم نے کہا اس پر غور کرو، اور جو کچھ اشارات و رموزات بیان ہوئے ان کے سمجھنے کی کوشش کرو، ہم پر سوء ظن کو راہ نہ دو، کیونکہ ستر ربوبیت کا افشا کرنا کفر ہے"،

غالباً ایسی ہی عبارتوں سے محققین کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ یہ جماعت سیاست سے تعلق رکھتی تھی، اور اپنے وقت کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی تھی، چونکہ ان کے چیدہ چیدہ خیالات اور تبلیغ و اشاعت کی نوعیت باطنیہ کے بعض خیالات و تبلیغی کاموں سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہے، اس لئے مستشرقین کو موقع ملا کہ اس جماعت کو بدنام کریں، چنانچہ کبھی تو ان کا رشتہ قرامطہ سے جوڑتے ہیں،

---

[۱] رسائل ج ۳ ص ۲۱۹ [۲] رسائل ج ۴ ص ۴۱۸ و ص ۴۱۹ [۳] ایضاً ج ۳ ص ۳۳۸، ص ۳۳۹، [۴] ایضاً ج ۴ ص ۴۳۰، ص ۴۱۹، ص ۴۱۸، ص ۴۱۳ [۵] ایضاً ج ۴ ص ۲۰۱، ص ۲۰۰ [۶] ایضاً ج ۳ ص ۲۱۲ [۷] ایضاً ج ۴ ص ۳۹۶ [۸] ایضاً ج ۳ ص ۱۳۳ طبع مصر،

اور کبھی باطنیہ سے[1]، حالانکہ اس جماعت کی اگر کوئی سیاسی غرض ہوتی تو ضرور کسی موقع پر اپنا زور دکھاتی، اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کم از کم اپنی قوت کا جائزہ لینے کی خاطر ہی کبھی ضرور کرتی جیسا کہ بعض شیعی فرقوں، قرامطہ اور باطنیہ سے ایسے واقعات وقتاً فوقتاً ظہور میں آتے رہے، لیکن جب ایسا کوئی تاریخی پس منظر ہمارے سامنے نہیں تو یہ حسن ظن ہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت بھی دیگر علمی و اجتماعی جماعتوں، معتزلہ و اشاعرہ وغیرہ کی طرح عوام کے اخلاق سنوارنے اور آپس کے اختلاف کو دور کرنے کیلئے محض سوشیل ورکس (Social works) کی خاطر معرض وجود میں آئی تھی، اور چونکہ اس دور میں علوم ریاضیہ، حساب، نجوم، عزائم و طلسم کا چرچا اہل علم میں عام تھا اسلئے انھوں نے اپنے مکتوبات کو فلسفہ، ریاضیات و طلسمات کا مرجع بنایا، گو ان رسائل سے دقیق علمی بحثوں پر روشنی نہیں پڑتی مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، کہ یہ رسائل اپنے عہد کے عربوں کے علمی مذاق اور سوشل کارناموں کا زندہ نمونہ ہیں، اور اس خیال سے ان کی قیمت اور دوبالا ہو جاتی ہے، کہ چوتھی اور پانچویں صدی کے عربوں میں علوم ریاضیہ و فلسفہ جس قدر متداول تھے ان کے صحیح خاکے ان ہی کے ذریعہ ہمارے نظر نواز ہوئے ہیں،

اخوان الصفا کا مذہب اور عقیدہ اخوان الصفا بظاہر مسلمان تھے، ان کی نشأت اسلامی تھی، ان کا فلسفہ اسلامی (؟) ہے، اس پر قائم ہے[2] اور ان کا اعتقاد تھا کہ اسلام سب دینوں میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب رسولوں میں افضل و بہتر ہیں اور اسلامیت 'عمدة العقیدہ' ہے، البتہ تفصیل میں ان کے عقائد اور اسلامی تعلیمات میں بعض بنیادی اختلافات ہیں مثلاً انکا عقیدہ ہے کہ شریعت محمدیہ باوجودیکہ 'عمدة العقیدہ' ہے، ناقص ہے، نیز جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے وہ رسولوں کا محتاج نہیں، (رسائل ج ۴ ص ۲۱)

[1] تفصیل کے لئے دیکھو لٹریری ہسٹری آف دی عربس نکلسن ص ۳۷۰ و ۳۷۲ فی تحاشت اولیری ص ۱۶۵، تاریخ فلسفہ اسلام ڈی بوئر ص ۸۹، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۴۵۹۔

حقیقی عبادت کے لئے ضروری ہے کہ صرف تسبیح و تقدیس ہو، فرائض نہ ہوں، شریعتوں کی تعیین انسانی گڑھنت ہے، اللہ کی وحی کے ذریعہ ان کا قیام نہیں ہوا وغیرہ وغیرہ (دیکھو فصل الہیات)

درحقیقت اس جماعت کا کوئی خاص دین و مذہب نہ تھا، اس کے یہاں دین، مذہب حتی کہ محمدؐ، علیؓ، قرآن، اہل بیت، نبیا، وغیرہ کے معانی کچھ اور تھا اور ان معانی سے بالکل مختلف ہیں، جو مسلمانوں میں خواہ وہ اہل السنت والجماعت ہوں یا شیعہ، رائج ہیں، ان کا مذہب فلسفہ، اخلاق، اور روحانیت ہے، ان کے مذہب کو صوفیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، ہر مذہب اور ہر علم کی خوبیوں کو اپنانا ان کا دین ہے، اور صفائے طینت و مودت و اخوت ان کا ایمان[1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جملہ علوم میں غور و فکر کرنا[2] علم و مال میں اشتراک[3] ان کا مذہب ہے، ان کے نزدیک حیات، روحانیت صداقت و نصیحت اور حسن معاملہ سے وابستہ ہے[4]، ان کے نزدیک اللہ کی عبادت نماز و روزہ نہیں بلکہ دین و دنیا کی تعمیر عبادت ہے[5]، اور عبادات شرعیہ یعنی صوم و صلوٰة اور حج بذاتہا مقصود نہیں ہیں یہ سب اصلی مقصد کے حصول کیلئے اشارے اور کنائے ہیں[6]، آخرت میں حقیقی نجات پانے والا وہ ہوگا جو ساری امتوں اور ادیان کے فضائل کا جامع ہوگا[7]، نجات صرف عبادات اور اخلاق سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے علوم و معارف پر حاوی ہونا بھی ضروری ہے[8]،

محققین کو ان کے مذہب کے بارے میں سخت دھوکا ہوا ہے، عام خیال یہ ہے کہ اخوان الصفا شیعہ تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ شیعہ بھی نہیں تھے، نہ امامیہ فرقہ سے ان کا تعلق تھا نہ اسماعیلیہ

[1] رسائل ج ۴ ص ۱۳، ۱۸، ۲۱۹، ۲۳۰، [2] ایضاً ج ۴ ص ۱۱۶، ۱۲۰، [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۹ ج ۴ ص ۲۲۱، ۲۲۴، [4] ایضاً ج ۱ ص ۲۶، [5] ایضاً ج ۲ ص ۱۳۱، [6] ایضاً ج ۴ ص ۱۴۳، [7] ایضاً ج ۴ ص ۱۵۶، ۱۵۷، [8] معارف فروری ۱۹۴۹ ص ۹۰، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ڈی بوئر، نکلسن، اولیری (دیکھو نوٹ نمبر ۱ صفحہ مضمون ہذا)

اور باطنیہ سے، مذہب شیعہ کے بنیادی رکن عقیدۂ امامت پر وہ اس طرح طنز کرتے ہیں،[۱]

"... یہی اس کا حکم ہے جو یہ رائے و اعتقاد رکھتا ہے کہ امام فاضل و ہادی پوشیدہ ہیں، اور اپنے مخالفین کے خوف سے ظاہر نہیں ہوتے، یہ عقیدہ رکھنے والا عمر بھر اپنے امام کے خروج کا منتظر رہتا ہے، کہ جلد از جلد امام نکلیں اور ظاہر ہوں، مگر اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے اور وہ اسی حسرت و غصہ میں مر جاتا ہے کہ اپنے امام کو نہیں دیکھ سکا ... بہر معلوم ہو کہ ایسی فاسد رائیں بہت ہیں"

گو اخوان الصفا خود اہل باطن ہونے کا دعوی کرتے تھے لیکن اس مذہب کے پیرووں کے سخت دشمن تھے، (ملاحظہ ہو رسائل ج ۴ ص ۵۸، ۵۹)

جماعت اخوان الصفا کے نظام و آئین اس جماعت کی مجلسیں اوقات معینہ میں خفیہ طور پر منعقد ہوا کرتی تھیں[۲] اس کے خاص قوانین تھے، اس کے ممبر بچے، جاہل، کمزور، بوڑھے اور عورتیں نہیں ہو سکتی تھیں، اس جماعت کے نزدیک عورتوں کا شمار عوام بچوں اور جاہلوں میں تھا،[۳]

ذیل کے اقتباس سے مجلس اخوان الصفا کے نظام پر روشنی پڑتی ہے[۴]

"ہمارے بھائیوں کو، اللہ ان کی مدد کرے سزاوار ہے کہ جس شہر میں بھی ہوں ان کی خاص مجلس ہونی چاہئے، جس میں معلوم وقتوں میں سب کا اجتماع ہوا کرے، اس میں وہ غیروں کو داخل نہ ہونے دیں، اور علوم و اسرار خصوصاً علم نفس حس و محسوس، عقل و معقول، اور کتب الہیہ، تنزیلات نبویہ اور موضوعات شرعیہ

۱؎ رسائل ج ۴ ص ۵۰۵ ۲؎ ایضاً ج ۴ ص ۲۳۰ ۳؎ ایضاً ج ۴ ص ۷ و ج ۲ ص ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۲۶ ج ۳ ص ۳۵۱، ۴۱۱، ۴۲۳ ج ۴ ص ۲۶، ۴۷، ۵۰، ۶۲، ۲۶۵، ۲۷۹ ۴؎ ایضاً ج ۴ ص ۲۳۷،

کے اسرار پر بحث و مذاکرہ ہوا کرے، اور علوم ریاضیات اربعہ یعنی عدد، ہندسہ، تنجیم اور تالیف کا تذکرہ بھی ہونا چاہئے لیکن زیادہ توجہ علوم الٰہیہ کی جانب جو اصل مقصود ہیں ہونی چاہئے"

اس نظام میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے مدارج و مراتب مقرر تھے، ہر ایک درجہ کا ایک نام تھا، چونکہ علوم و معارف کے قبول کرنے کی صلاحیت اور تہذیب نفس کی استعداد طبائع میں مختلف ہوتی ہے، اور قوائے عقلیہ میں بلحاظ سن و سال کے بتدریج پختگی پیدا ہوتی ہے، اسلئے اخوان الصفا کے چار طبقے مقرر کئے گئے تھے،[۱]

طبقۂ اولی:- اخوان ابرار رحماء، اس میں وہ لوگ ہوتے جو عمر کے پندرہ سال طے کر چکے ہوتے اور جن میں قوت عاقلہ ممیزہ ابھر چکی ہوتی یہ طبقہ دوسرے طبقوں سے اس لحاظ سے ممتاز ہوتا کہ ان میں جوہر نفس کی صفائی، علوم و فنون کے قبول کرنے کی اہلیت اور سرعت تصور جیسی صفتیں موجود ہوتی ہیں،

طبقۂ ثانیہ:- اخوان اخیار فضلاء، ان میں وہ لوگ ہوتے جن کی عمر تیس سال کی ہوتی، اور جن میں قوت حکیمہ ابھر چکی ہوتی، ان کے امتیازی اوصاف یہ تھے، اخوان کی رعایت، سخاوت نفس، اعطار فیض و شفقت و رحمت، نیز شفقت علی الاخوان

طبقۂ ثالثہ:- اخوان فضلاء کرام، وہ لوگ جو عمر کی پختگی یعنی چالیس سال کو پہنچ چکے ہوتے، اور ان میں قوت ناموسیہ ابھر چکی ہوتی ہے،

طبقۂ رابعہ:- اس طبقہ کا نام نہیں بتایا گیا، اس کے اوصاف یہ لکھے گئے ہیں، جن کی عمر پچاس برس کی ہو چکی ہوتی اور ان میں قوت ملکیہ پیدا ہو چکی ہوتی، اس درجہ میں نفس ان مدارج

۱؎ رسائل ج ۴ ص ۱۱۹، ۱۲۰،

کو جن کے ذریعہ حق کو عیاناً دیکھ سکتا ہے طے کر چکتا ہے، اور عالم ملکوت سے مل جاتا ہے، اور قیامت، بعثت، حساب اور مجاورت رحمٰن کے حقائق کا ادراک کرنے لگتا ہے،

اخوان الصفا کی تصنیفات رسائل اخوان الصفا کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جماعت کی تصنیفات میں رسائل کے علاوہ چار کتابیں اور ہراسلات، ردّ اور سوالات کے جوابات بھی ہیں، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں[1]:

"جماعت اخوان الصفا کے مختلف رسائل ہیں، اور ایسی ہی ان کی چار کتابیں اور مشہور ہیں جن کو لوگ پڑھتے ہیں، مگر سمجھتے نہیں، اس لئے وہ لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ان کی مجلسوں میں آکر ان کتابوں کو پڑھیں اور سمجھیں۔"

رسائل اخوان الصفا کی تالیف ان رسائل کے لکھنے کا سبب جیسا کہ خود ان کا بیان ہے یہ تھا کہ جماعت کے بہت سے اخوان (ممبران جماعت) مرکز دعوت سے دوری کی بنا پر مجالس الاخوان میں حاضر نہیں ہو سکتے تھے ان کے لئے یہ رسائل لکھے گئے تاکہ مجالس کی کارروائی سے سب اخوان باخبر ہوتے رہیں، اور ان کو معلومات حاصل ہوتے رہیں[2]،

چونکہ اخوان الصفا نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے ناموں کو چھپایا تھا، اس لئے یہ بحث بیکار ہے کہ کن لوگوں نے ان رسائل کو تالیف کیا؟ اور ان رسائل کے لکھنے والوں میں کون کون لوگ شریک تھے؟ قفطی نے چند نام گنائے ہیں[3]، اور انھوں نے اپنا ماخذ ابوحیان التوحیدی کی مقابسات کو قرار دیا ہے، جس میں زید بن رفاعہ کے متعلق جو اخوان الصفا کا سرگروہ سمجھا جاتا ہے[4]، یہ مذکور ہے کہ زید جماعت اخوان الصفا کے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور ان کی صحبت میں رہا تھا، جو اس

[1] رسائل ج ۴ ص ۲۰۶، ۲۰۷ [2] ایضاً ج ۴ ص ۱۲۱ [3] اخبار الحکماء ص ۵۹ [4] مصری کی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۴۵۹ و امیر علی اسپرٹ آف اسلام ص ۴۳۵ و اولیری عربک تھوٹ Arabic Thought ص ۱۷۰

بات کی دلیل ہے کہ زید بھی کم از کم ایک ممبر ضرور تھا، ورنہ اس محتاط جماعت کے ممبر زید کے ساتھ کھل کر نہ ملتے، اور اس قدر خلا ملا نہ رکھتے، مقابسات کی عبارت کا یہ فقرہ[5] فصحبھم وخدمھم بتاتا ہے کہ زید اخوان الصفا کی آرا اور مذاکرات سے پوری طرح واقفیت رکھتا تھا، اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اخوان الصفا اپنی مجلسوں میں غیروں کو شامل نہیں ہونے دیتے تھے[6]، اور زید اخوان الصفا کا صحبت یافتہ تھا، اور اس نے ان کی خدمت بھی کی تھی، اور لفظ خدمت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد تبلیغ و اشاعت یا نشر و تالیف ہے، کیونکہ اس کے علاوہ اور اس جماعت کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی،

رسائل کی زبان بتاتی ہے کہ یہ رسائل بیک وقت نہیں لکھے گئے بلکہ مختلف اوقات میں مختلف ممبروں کیلئے الگ الگ تحریر میں لائے گئے،

جماعت اخوان الصفا نے اپنی نشو و نما کے لئے رسائل کی تحریر کی ضرورت کو بہت بعد میں محسوس کیا، اور جیسا کہ ابوحیان التوحیدی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے[7]، ان رسائل کے کچھ حصے ۳۷۳ھ سے قبل بھی مشہور تھے، نیز ان کی تالیف کا سلسلہ ۴۰۰ھ کے بعد تک جاری رہا[8]، پھر جب اس پر غور کیا جائے کہ ان رسائل میں اشاعرہ اور مشبہہ پر بھی کثرت سے حملے کئے گئے ہیں، تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پانچویں صدی کے اختتام تک اس کا سلسلہ جاری رہا ہوگا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حصے اور بھی بعد میں بڑھائے گئے ہیں،

البتہ ان تمام رسائل کی بنیاد ایک ہی اعتقاد اور ایک ہی خیال کے ماتحت ان کی تحریر عمل میں آئی ہے،

[5] ابوحیان، مقابسات ص ۴۶ طبع مصر، [6] مضمون ہذا ص ۹ [7] مقابسات ص ۴۶، ۴۷ [8] البلاغ الفتح البستی (المتوفی قریباً سنہ ۴۰۰ھ) کے اشعار کا وجود اس کی صاف دلیل ہے،

رسائل کی تعداد

رسائل اخوان الصفا کے جزو اول سے پتہ چلتا ہے کہ ان رسائل کی تعداد باون[1] ہے لیکن باقی تینوں اجزاء میں ان کی تعداد اکیاون[2] بتائی گئی ہے[3]،

ان اکیاون رسالوں کے علاوہ فہرست اخوان الصفا بھی ہے، جس میں رسائل کی تعداد اور مضامین کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے، بظاہر یہ فہرست رسائل کی کتابت سے قبل لکھی گئی ہے[4]،

ان رسائل کے اخیر میں 'الرسالة الجامعة' یا 'الفضل الجامع' کے عنوان سے ایک اور رسالہ بھی ہے جس میں سارے حقائق کا استقصار کیا گیا ہے[5]، اس کو سارے رسائل اخوان الصفا کا نچوڑ سمجھنا چاہئے، اس کے متعلق خود رسائل میں حسب ذیل رائے ظاہر کی گئی ہے[5]،

"دراصل یہی اصل مقصود اور اسی پر دین و دنیا کی کامیابی موقوف ہے"

اس لئے ان رسائل کی تعداد باون[1] ہوتی ہے،

---

[1] رسائل ج ۱ ص ۱۰۱، ۸۰، ۴۴ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۳، ج ۳ ص ۴۸، ج ۴ ص ۱۲۶، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱ [3] ایضاً ج ۴ ص ۳۲۰ [4] ایضاً ج ۱ ص ۱۹ [5] ایضاً ج ۱ ص ۲۲،

(سلسلہ تاریخ اسلام)

تاریخ صقلیہ جلد اول

اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج اور مسلمانوں کے مصائب اور جلاوطنی کا مرقع دکھایا گیا ہے، قیمت للعہ، ۵۴۶ صفحے،

"منیجر"

مخطوطہ فتح المنان
فی
تائید مذہب النعمان

از جناب مولوی ابویحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی

معارف (ج ۶۴ ص ۴۵۰) میں مولینا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نے کتاب مذکورۃ الصدر پر تبصرہ فرمایا تھا، ذیل کی سطور اسی کا تکملہ ہیں،

اور ممدوح نے اپنے مضمون میں فتح المنان کے جس نسخہ کا تذکرہ فرمایا ہے وہ مولانا محمد طاہر مرحوم (م ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۸ء) کے کتب خانہ میں ہے جو شاہ محمد اسحاق دہلوی (۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء) کے شاگرد تھے،

اس کا دوسرا مخطوطہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی[1] میں تھا، جو دہلی کے گذشتہ فساد میں تباہ ہوگیا، افسوس اس بزم تحدیث کی، ۲۸ سالہ (از ۱۳۳۹ھ تا ۱۳۶۶ھ) علمی بہاریں یوں لٹ گئی،

---

[1] اہل حدیث کی یہ تعلیم گاہ باڑہ ہندوراؤ دہلی میں تھی اس کے بانی شیخ عبدالرحمان مرحوم ہیں، جن کی رحلت کے بعد آپ کے حاتم صفت بھائی میاں عطاء الرحمٰن متولی مقرر ہوئے اور ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے حاجی عبدالوہاب صاحب ان کے جانشین قرار پائے، تعلیم گاہ کے کل مصارف متولی کے ذمہ تھے آخری زمانہ میں مدرسہ میں ۶ اساتذہ اور ۶۰، ۷۰ تک طلبہ تھے، طالب علموں کی ذہنی تربیت اور مشق کیلئے ایک ماہانہ رسالہ "محدث" نکلتا تھا، مدرسہ کا واٹر ورکس تک اپنا ذاتی تھا، اور آج تک اس مدرسہ کے تقریباً ایک سو فارغ التحصیل حضرات ملک کے مختلف اطراف میں مصروف تدریس و تبلیغ ہیں، مقدمہ تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی جس کی بنا مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے رکھی تھی اس کی تکمیل اسی دار الحدیث کے باخبر فارغ اور شیخ الحدیث مولانا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۰ پر)

اصل کتاب کا تذکرہ فتح المنان کے اس دہلوی مخطوطہ کے ۶۲۵ صفحات ہیں، ہر صفحہ میں ۱۴ سطریں ہیں، کاتب کا نام محمد انوار الحق دہلوی ہے، جو مولف فتح المنان شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) کو اپنا جد لکھتے ہیں، خاتمہ کتاب پر کاتب کی عبارت یہ ہے،

"تم ھذا الکتاب المستطاب المسمی بفتح المنان فی تائید مذھب النعمان للشیخ الاجل الحبر النبیل ومصداق علمائے امتی کانبیاء بنی اسرائیل مسندی وجدی ابی المجد الشیخ عبدالحق محدث الدھلوی روح اللہ روحہ واوصل الینا فتوحہ فی عشیۃ یوم السبت تاریخ الثامنۃ والعشرین مضت من ذی الحجۃ المنسلکۃ فی مشھور سنۃ تسع وتسعین والمائتین بعد الالف (سنہ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) من الھجرۃ بتوفیقہ تعالیٰ علی ید اقل عبدہ الراجی محمد انوار الحق الدھلوی تاب اللہ علیہ والحمد للہ رب العالمین" (ص ۵۶۶)

کتاب کا آغاز "الحمد للہ الذی ارسل محمداً وجعلہ سید المرسلین" سے ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۹) عبیداللہ صاحب مبارکپوری نے کی، ان دنوں آپ شرح مشکوٰۃ المصابیح پر متوجہ ہیں (؟) مدرسہ رحمانیہ کی عمارت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو ہبہ کردی گئی ہے، کتب خانہ او کھلا جامعہ نگر میں منتقل ہوگیا، مخطوطہ فتح المنان فی تائید مذہب النعمان بھی جامعہ ہی میں ہے، اسی کتب خانہ میں امام شوکانی کی سیل الجرار کا مخطوطہ بھی راقم السطور نے دیکھا ہے، اور شیخ عبدالوہاب اپنی بہت بڑی غیر منقولہ املاک کوڑیوں کے مول فروخت کرکے کراچی ہجرت کر گئے اور یہ پورا المیہ راقم کے سامنے (دسمبر ۱۹۴۷ء) میں وقوع پذیر ہوا،

مولف نے امام ابن ہمام کے فیض کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے،

وجزی اللہ عنا الشیخ الاجل الاکرم الاعظم کمال الدین ابن الھمام رحمہ اللہ العلیم العلام حیث حقق ھذا الامر واثبت المذھب بالاحادیث الصحیحۃ والحسنۃ الصالحۃ للاحتجاج واثبت احادیث المتن وایضاً اجاب عن دلائل الشافعیۃ عند الاحتیاج" (ص ۴)

حضرت شاہ عبدالحق شافعی مسلک اختیار کرنے پر مائل ہو چکے تھے جس کا ثبوت حسب ذیل عبارت سے ملتا ہے،

ولما کنت انا العبد المسکین	میں مسکین عبدالحق بن سیف الدین
عبدالحق بن سیف الدین دھلوی	جو وطن کے لحاظ سے دہلوی خاندان کے
وطناً والبخاری اصلاً والترکی	لحاظ سے بخاری نسل کے لحاظ سے ترکی،
نسلاً والحنفی مذھباً والصوفی	مذہب کے لحاظ سے حنفی مشرب کے لحاظ سے
مشرباً والقادری طریقۃً	صوفی اور طریقہ کے لحاظ سے قادری
بالحرمین الشریفین زادھما اللہ	ہوں جب حرمین شریفین میں کتاب مشکوٰۃ
تشریفاً وتعظیماً وکنت اقرء	پڑھی تو میرے خیال میں یہ بات آئی کہ
کتاب المشکوٰۃ وقعت فی ھذہ	فوراً شافعی مذہب میں داخل
الخیال وھممت ان ادخل فی مذھب	ہو جاؤں،
الشافعی فی الحال ... (ص ۴۶۵)	... ...

لیکن پھر شیخ عبدالوہاب المتقی کی رہنمائی سے اس ارادہ سے باز رہے،

... فعرضت ذلك على سيدی الشيخ
العالم العامل المقتدی لعلو
و علم الهدی و نور التقی و صاحب
الاستقامة التی هی فوق الکرامة
و الکرامة التی تحصل بعد الاستقامة
ابی المواهب صفی الدین عبد الوهاب
المتقی القادری الشاذلی"
قال من این وقعتم فی هذا
الخیال لعلکم لکم علیه قرءة
المشکوة بالاستعجال وقال
ما هو الا انهم تتبعوا الاحادیث
الواقعة موافقة لمذهبهم
فاوردها فی کتبهم مکررة و
اهملوا احادیث اخری راجحة
علیها یثبت مذهبنا مکررة
کما مر"
ثم ذکر الشیخ مناقب الامام
ابی حنیفة وقال کان لهذا الامام
الرفیع الشان تقدم فی الزمان

میں نے اس خیال کو شیخ صفی الدین
عبد الوہاب کے سامنے پیش کیا
جو بلندی اور ہدایت کے پہاڑ، تقوی
کے نور اور ایسے صاحب استقامت
تھے جو کرامت سے بڑھ کر تھی، ایسی
کرامت جو استقامت کے بعد حاصل
ہوتی ہے، انھوں نے فرمایا کہ تمھارے
دل میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا؟
غالباً عجلت کے ساتھ مشکوٰۃ کے پڑھنے
سے پیدا ہوا ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے
کہ وہ اپنے مذہب کے موافق حدیثیں
تلاش کرکے ان کو اپنی کتابوں میں
بار بار لائے لیکن دوسری حدیثیں
بھی ہیں، جو ان پر ترجیح رکھتی ہیں
اور ہمارا مذہب ان سے بار بار ثابت
ہوتا ہے جیسا کہ گزرا
پھر انھوں نے امام ابوحنیفہ کے مناقب
بیان فرمائے کہ ان کو تقدم زمانی
حاصل تھا، اور ان کے اصحاب

وکان له اصحاب من التابعین
و اتباعهم من العلماء المتقنین
المتورعین الفقهاء المتقین المحققین
اکثرها لغیره من المجتهدین
الی آخر ما قال من المقدمات
فی تقریر هذا الکلام مما یوصل
الی تحقیق المرام" (ص۷)

تابعین اور تبع تابعین میں جو متقی،
پرہیزگار، فقیہہ اور محقق تھے اور
مجتہدین سے زیادہ تھے، اس کے
علاوہ اس کے ثبوت کے لئے
اور بھی بہت سے مقدمات بیان کیے
جن سے اصل مقصد کی تحقیق ہوتی
تھی،

اس گفتگو سے شاہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ حنفیت پر قائم رہے،

فذهب منی ذالك الخیال و
انقلبت الحال ثم لما اراد
الشیخ رحمة لعد ان یودعنی
الی الوطن التمست منه ان
یمکننی فی خدمته برهة
من الزمن حتی احبث و اتحقق
مذاهب الائمة الاربعة
خصوصاً هذین المذهبین
اعنی مذهب الحنفیة و
الشافعیة لکونهما واقعین
فی البین حتی یتحقق الامر و یظهر الحق

اب میرا یہ خیال زائل ہو گیا اور
حالت بدل گئی، پھر جب انھوں نے
مجھے وطن جانے کیلئے رخصت کرنا
چاہا تو میں نے ان سے درخواست
کی کہ مجھ کو چند دنوں اور اپنی خدمت
میں رہنے کی اجازت مرحمت ہو،
تاکہ میں ائمہ اربعہ بالخصوص
امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کی
مذہب کی تحقیق کر لوں، کیونکہ
ان دونوں میں بڑا اختلاف
ہے، تاکہ حق ظاہر ہو جائے، انھوں نے

فی ذالک" "قال یحصل لکم ان شاء اللہ تعالیٰ هذه الامر هنا لک وتحصل ببرکة نفسه الشریف فی شرح المشکوة من ذالک الاشیاء" (ص۶)

فرمایا اگر خدا نے چاہا تو تم کو وطن ہی میں یہ بات حاصل ہو جائے گی، اور خود شرح مشکوۃ کے ذریعہ یہ باتیں ان کی ذات کی برکت سے معلوم ہو جائیں گی،

. . . .

اور پھر حنفی مذہب سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کی تائید میں فتح المنان فی تائید مذہب ابی حنیفة النعمان لکھی، اس کے طرز تالیف کے متعلق لکھتے ہیں،

"ثم انه قد اتفق تالیف هذه الکتاب علی طریقین احدهما انها اقتضیت اثر صاحب المشکوة فی سرد الابواب والفصول واوردت من غیرها الاحادیث من سائر الاصول ونبهت فی کل اصل علی مواضع الاختلافات علی ما شرطت من ذکر الاستدلالات والمتمسکات فختم علی هذه النمط الی کتاب الجنائز

یہ کتاب دو طریقوں پر مرتب کی گئی ہے، ایک تو ابواب اور فصول میں میں نے صاحب مشکوۃ کی پیروی کی لیکن مشکوۃ کے علاوہ اور کتابوں سے بھی حدیثیں لی ہیں، اور ہر اصل میں مقام اختلافات پر تنبیہ کردی ہے اور جیسا کہ شرط کی تھی، اس کے دلائل و براہین بھی بیان کئے ہیں اور اسی طرز پر کتاب الصلوۃ کے آخر کتاب الجنائز تک پوری کتاب لکھی ہے۔

آخر کتاب الصلوة" "ومن هنا الی کتاب البیوع اخذت المسائل الاختلافیة من الکتب الفقهیة للائمة ونقلت دلائلها ومباحثها المذکورة ثمة" فتم القسم الاول علی نمط کتب الحدیث والثانی مثل کتب الفقه ومقصودنا من هذه الکتاب هو تائید مذهب الحنفیة حاصل فی الوجهین ...."

اس کے بعد سے کتاب البیوع تک میں نے اختلافی مسائل ائمہ کی فقہی کتابوں سے لئے ہیں اور ان میں جو دلائل و مباحث مذکور تھے ان کو نقل کیا ہے اس لئے کتاب کا پہلا حصہ حدیث کی کتابوں کے طریقہ پر مرتب ہے اور دوسرا فقہی کتابوں کے طریقہ پر اس کتاب سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس سے مذہب حنفیہ کی تائید ہو جو دونوں طریقوں سے حاصل ہے،

. . . .

حنفی کے لئے شافعی امام کے اقتدار کے بارہ میں شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے

احدها حدیث ابی هریرة رواه مسلم اذا اقیمت الصلوة فلا صلوة الا المکتوبة وقد لزم هذا علی الحنفیة فی الحرمین الشریفین زادهما الله تشریفاً وتعظیماً یقیم الشافعیة

حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک مشہور حدیث ہے جس کی روایت مسلم نے کی ہے کہ جب نماز کھڑی ہو جائے تو پھر صرف فرض نماز پڑھنی چاہئے اس حدیث کی بنا پر حرمین شریفین میں جب شافعیہ نماز فرض ادا کرتے ہیں

الصلوٰة والحنفية يشتغلون
بالسنن والنوافل ولهم عذر
في ذلك الكلام في الاقتداء
بالشافعية منعاً وجوازاً فبعضهم
يقتدون بهم خروجاً من
هذه الورطة وبعضهم
لا يقتدون خوفاً من الورطات
الاخر في اختلافهم في باب
الطهارة و انتقاض الوضوء
و امثال ذلك فحيث يعلم
رعايتهم مواضع الخلاف
يجوز وحيث لا يعلم لم يجز
"فهذه من المواضع التي ابتلي
اهل الحرمين فيها من تجويز
تكرار الجماعة المذاهب
الائمة الاربعة خصوصاً
الشافعية والحنفية وقد
استوفى ذلك بعض الفقهاء
المحدثين من اہل المدينة وعملوا فيه كتاباً

اور حنفیہ سنن و نوافل کی نماز پڑھتے ہوتے
ہیں تو منع وجواز کے رو سے اس مشکل
سے بچنے کے لئے بعض حنفیہ تو ان کی
اقتدار کرتے ہیں اور بعض اقتدار
نہیں کرتے تاکہ طہارت اور وضو
کے ٹوٹنے وغیرہ کے بارے میں ان دونوں
مذہبوں میں جو اختلافات ہیں ان سے
بچیں اس لئے اختلافی مسائل میں جہاں
اختلاف کی رعایت مناسب معلوم
ہو وہاں ان کی اقتدار جائز ہے،
اور جہاں مناسب نہ معلوم ہو وہاں
جائز نہیں ہے، انہی حالات واسباب
کی بنا پر اہل حرمین نے مجبوراً مذاہب
اربعہ بالخصوص شافعیہ اور حنفیہ
کی مکرر جماعت کو جائز رکھا ہے اور
مدینہ کے بعض فقہائے محدثین نے ان
مسائل پر مفصل کتاب لکھی ہے،

وقد عرضت هذه الواقعة
على سيدي الشيخ عبد الوهاب
المتقي رحمة الله عليه وقلت
ما المخرج عنها؟ قال اثبتوا
انتم على حنفيتكم لا تذبذبوا
(ايضاً في كتاب الصلوٰة)

وفیات
میں نے اس واقعہ کو سیدی شیخ عبد الوہاب
المتقی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بیان کرکے
اس کا حل دریافت کیا تو فرمایا کہ اپنے
حنفی مسلک پر قائم رہو، اور اس میں
تذبذب کو راہ نہ دو،

.. ..

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ المتقی بھی اقتدائے شافعی میں محتاط ہیں،

مسلک حنفیہ کی تائید میں تقریباً اسی قسم کی چار اور تالیفات کا تذکرہ ملتا ہے،

(۱) المعرفة المنيفة في ترجيح مذهب ابي حنيفة یہ اس موضوع پر سب سے پہلی تالیف ہے، اس کے مولف سراج الهند عمر بن اسحاق الغزنوی الهندی م ۷۷۳ھ / ۱۳۷۶ء ہیں، مولانا عبد الحی لکھنوی نے سراج الهند کے لقب کے ساتھ ان کا تذکرہ فرمایا ہے،

وہ ہندوستان کے اساتذہ اور شیوخ میں ہیں اور امام وجیہ الدین دہلوی ملک العلما سراج الدین ثقفی دہلوی رکن الدین بدایونی سے ان کو شرف تلمذ حاصل تھا

(۲) دوسری عقود الجواهر المنيفة في ادلة امام ابي حنيفة ہے، اس کے مولف علامہ سید محمد مرتضیٰ بلگرامی الزبیدی م ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء ہیں، یہ مصر میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے،

(۳) تیسری تالیف مولینا محمد بن علی المعروف بہ ظہیر احسن شوق نیموی بہاری کی آثار السنن ہے اس کتاب میں مباحث کے بجائے بلوغ المرام من ادلة الاحکام کے طریقہ پر مسلک حنفیہ کی تائید میں احادیث و آثار جمع کی گئی ہیں[1]

(۴) چوتھی کتاب صحیح البہاری مرتبہ مولانا ظفر الدین صاحب مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ ہے یہ بھی آثار السنن کے طریق پر ہے،

[1] معارف پانچویں مولانا اشرف علی تھانوی کی اعلاء السنن ۲۰ جلدوں میں۔

وفیات

سید حسین کی موت

میں

بعض غلطیوں کی تصحیح

جناب بشیر الحق صاحب بیدل

میرے ایک ہموطن عزیز بشیر الحق صاحب بیدل جو ان حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں مضمون مذکور کی غلطیوں کی تصحیح کرکے بھیجی ہے جو نذر ناظرین ہے،

اپریل کے معارف میں "سید حسین کی موت" کے عنوان سے جو نوٹ آپنے دیا ہے، میرے خیال میں اس میں دو تین جگہ آپ سے تسامح ہو گیا ہے،

(۱) میرے علم میں نواب سید محمد آزاد کے مضامین اپنچ بانکی پور پٹنہ میں کبھی نہیں نکلے، ان کے مضامین مشیر قیصر لکھنؤ اور اودھ پنچ میں نکلتے تھے،

(۲) آپنے لکھا ہے کہ سید حسین اس وقت ۶۲ برس کے تھے، اور ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے اس حساب سے انکی عمر صرف ۵۲ سال ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کاتب کی غلطی سے ۱۸۸۶ء کی جگہ ۱۸۹۶ء چھپ گیا ہے اس حساب سے بھی ان کی عمر ۶۳ سال ہوتی ہے،

(۳) سید حسین صاحب کے ایک ہی بھتیجے کی شادی دیسنہ میں ہوئی ہے گذشتہ سال کے شروع میں جس لڑکے کی شادی دیسنہ میں ہوئی وہ سید حسین کے بڑے سوتیلے بھائی ڈپٹی اشرف صاحب مرحوم کا نواسہ ہے،

مطبوعات جدیدہ

مسلم دیش بھگت اور آج کے تمہید

از جناب رتن لال صاحب بنسل فیروزآبادی تقطیع چھوٹی ضخامت علی الترتیب ۴۲، و ۱۶ صفحے کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲؍ و ۸؍ پتہ دفتر نیا ہند ۴۵ بائی کا باغ الہ آباد،

انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے لی تھی، اور وہ مذہبی حیثیت سے بھی نصاریٰ کی حکومت کو گوارا نہیں کر سکتے تھے، اس لئے سب سے پہلے انہی نے اس زمانہ میں انگریزی حکومت کی مخالفت اور ہندوستان کو ان سے آزاد کرانے کی کوشش کی جب ہندوستانیوں میں سیاسی شعور بھی پیدا نہ ہوا تھا اور اس راہ میں انھوں نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں جس کا سلسلہ ہندوستان کی آزادی ملنے تک برابر قائم رہا لیکن اس آخری زمانہ میں بعض ایسے واقعات پیش آگئے کہ ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد میں مسلمانوں کا نام ہی اڑا دیا گیا اور آج وہ اس کے فوائد کے حقدار بھی نہیں سمجھے جاتے لائق مصنف نے جو سچے کانگریسی اور ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے حقیقی حامی ہیں، مذکورہ بالا خیال کی تردید کے لئے یہ کتاب لکھی ہے اور اس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے لیکر شیخ الہند مولانا محمود الحسن تک اس سلسلہ کے مجاہد بزرگوں اور جدید دور کے بعض محبان وطن کے حالات اور ہندوستان کی آزادی میں ان کی خدمات اور قربانیوں کا ذکر کیا ہے یہ حالات بیشتر مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اس میں شبہہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی بعض کتابوں میں سیاسی و اقتصادی مسائل بھی ملتے ہیں لیکن مولانا عبید اللہ نے ان کی جو تعبیریں کی ہیں یا اس سلسلہ کے بزرگوں کے مجاہدات سے جو نتائج اخذ کئے ہیں اس میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے لیکن انگریزی حکومت کے ساتھ ان بزرگوں کی مخالفت اور

ان کے خلاف عملی جد و جہد مسلم ہے جس کو افسوس ہے کہ جدید ہندوستان نے بالکل فراموش کر دیا ہے، اس لئے تاریخ کے ان صفحات کو سامنے لانے کی ضرورت تھی، لیکن مسلم دیش بھگت میں مظہر الحق صاحب مرحوم کا تذکرہ بے جوڑ سا ہے، یا پھر ان کے ساتھ حکیم اجمل خان مرحوم ڈاکٹر انصاری مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی وغیرہ کا بھی ذکر ہونا چاہئے تھا، آج کے شہیدین موجودہ زمانہ کے ان محبان وطن کا تذکرہ ہے جنھوں نے گذشتہ ہندو مسلم فساد کو روکنے میں اپنی جان دی، مولانا برکت اللہ بھوپالی کے حال میں مصنف کے یہ فقرے سبق آموز اور موجودہ ذہنیت پر نہایت صحیح تبصرہ ہے کہ اگر آج مولانا برکت اللہ ہوتے تو پاکستان کے کسی جیل میں ہوتے کیونکہ وہ ہندو مسلم ایکتا کے حامی تھے اور یہ بربادی اور آپس کی نفرت برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اگر ہندوستان میں ہوتے تو اسی ملک کے بچے کے ہندوستان میں رہنے پر اعتراض کرنے اور ان کی وفاداری پر کوئی ایسے صاحب شک کرتے نظر آتے جن کی پوری عمر برٹش حکومت کے تلوے سہلانے میں بیتی، دونوں کتابوں کی زبان مستقبل کی متخیلہ عام فہم ہندوستانی ہے جہاں کوئی عربی فارسی یا ہندی کا مشکل لفظ آگیا ہے تو بریکٹ میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے، آج کل زبان سے تو متحدہ قومیت کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن عمل اور متحدہ قومیت کی تعمیر کے طریقے اس کے بالکل خلاف ہیں، لائق مصنف نے اس کا صحیح طریقہ اختیار کیا ہے ان کی یہ کوشش قومی نقطۂ نظر سے بڑی قابل قدر ہے، کاش ہمارے سیاسی رہنماؤں اور ارباب حکومت کو بھی اس کی توفیق ہوتی،

خطبوں کا مجموعہ اور دیہات میں جمعہ کا جواز — از مولانا ابو بکر محمد شیث [illegible] ، تقطیع بڑی ضخامت ۹۶ صفحے کاغذ کتابت وطباعت ستھری قیمت آٹھ آنے، پتہ دائرہ مطبوعات ملیہ جونپور، و دار المصنفین اعظم گڈھ

مصنف مرحوم کی ذات اور علمی و دینی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، انھوں نے خطبوں کا ایک مجموعہ بھی تالیف و مرتب کیا تھا، اس میں جمعہ میں پڑھنے کے خود مصنف کے بارہ خطبے مع ترجمہ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا اسمٰعیل شہید اور فقیہ ابو اللیث سمرقندی کے خطبات اور نکاح، استسقا، چاند گرہن اور سورج گرہن کی نمازوں کے خطبے بھی شامل کر دیے گئے ہیں آخر میں دیہات میں نماز جواز پر ایک مختصر رسالہ بھی ہے

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولنا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ میں اترا تھا، اور اُن کی پہلی حکومت یہیں قائم ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہاں حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایاں ہیں لیکن اس کے باوجود اُردو میں اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ موجود نہیں تھی، دار المصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ میں یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس میں سندھ کا جغرافیہ مسلمانوں کے حملے سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے وقت میں شائع ہو رہی ہے، جب کہ سندھ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل رہا ہے، اور وہاں ایک نئی حکومت کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں،

ضخامت: ۴۰۰ صفحے قیمت: چھ روپیے،

"مینیجر"